صفر المظفر ۱۴۴۱ھ
اکتوبر ۲۰۱۹ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خصوصی اشاعت

فریضۂ اِقامتِ دین

بسلسلہ دعوتِ فکرِ اسلامی مہم

Oct 2019
Vol.68

Regd. CPL No.115
No.10

Monthly Meesaq Lahore

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد

جلد : 68

شمارہ : 10

صفر المظفر 1441ھ

اکتوبر 2019ء

فی شمارہ -/40

(اس شمارے کی قیمت 80 روپے)

مُدیر

حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرونِ ملک 400 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

رابطہ برائے ادارتی امور: +92 322 4585384

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیمِ اسلامی: "دارالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 79-35473375 (042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

دعوتِ فکرِ اسلامی اور فریضۂ اقامتِ دین — حافظ خالد محمود خضر

تذکرہ و تبصرہ — 9

کربلا سے کشمیر تک — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن — 14

سورۃ حٰمٓ السجدۃ (آیات ۲۶ تا ۵۴) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مطالباتِ دین — 37

فریضۂ اقامتِ دین — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

العُروۃُ الوثقٰی — 75

فریضۂ اقامتِ دین: اسلاف کی آراء و تعامل — عبدالسلام عمر

اک عرضِ تمنّا ہے — 113

نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا ایک قابلِ عمل اور مؤثر طریقِ کار — حافظ عاکف سعید

انتخابی کشمکش اور انقلابی جدوجہد کا تقابلی مطالعہ — 124

سبق پھر پڑھ — 127

تنظیمِ اسلامی کا پیغام: نظامِ خلافت کا قیام — شجاع الدین شیخ

منہجِ انقلابِ نبویؐ — 141

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ — انجینئر نوید احمدؒ

حسنِ انقلاب — 149

تبلیغ کس لیے؟ — مولانا امین احسن اصلاحیؒ

گاہے گاہے باز خواں — 163

تنظیمِ اسلامی شمالی امریکہ: ماضی، حال اور مستقبل — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ظروف و احوال — 187

مسئلہ کشمیر: ماضی و حال کے آئینے میں — نعیم اختر عدنان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوتِ فکرِ اسلامی اور فریضۂ اقامتِ دین

ایک بندۂ مؤمن کا اصل نصب العین رضائے الٰہی کا حصول اور محاسبۂ اُخروی میں کامیابی ہے۔ اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے قرآن حکیم اور سُنّت و سیرتِ رسول ﷺ سے ہمیں دین کے تقاضوں اور مطالبوں کی صورت میں دینی فرائض اور ان کے لوازم کا ایک مکمل خاکہ ملتا ہے۔ لیکن اُمّتِ مُسلمہ کا المیہ یہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ جب دینی فرائض اور ان کے لوازم کا یہ مکمل اور جامع خاکہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دینِ اسلام کا بحرِ بیکراں ''مذہب'' کی تنگنائے کی صورت اختیار کر گیا اور اسلام محض چند عقائد' عبادات اور معاشرتی رسومات کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ خاص طور پر یورپی اقوام کے نوآبادیاتی تسلّط نے مسلمانوں کے قلوب و اذہان کو اس طرح گرفت میں لیا کہ ان کے تصوراتِ دین محدود بھی ہو گئے اور مسخ بھی۔

برعظیم پاک و ہند میں علامہ اقبال نے اپنی شاعری سے ملّتِ اسلامیہ کے تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ علامہ اقبال نے مسلمانانِ ہند کو اپنے پُرتاثیر کلام کے ذریعے قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی جانب متوجہ کیا۔ اس سے ان کے پیشِ نظر مسلمانوں کو قرآن کے انقلابی فکر سے روشناس کرانا اور اس طرح اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنا تھا۔ بانی تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کے نزدیک دورِ حاضر میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید میں سب سے بڑا حصہ علامہ اقبال کا ہے۔ مسلمان بحیثیتِ مجموعی اس اہم حقیقت کو فراموش کر چکے تھے کہ اسلام محض ایک مذہب نہیں' دین ہے' جو پورے نظامِ اجتماعی پر اپنا غلبہ و اقتدار چاہتا ہے۔ اقوامِ مغرب کی غلامی نے انہیں اس درجے پست ہمت اور کوتاہ فکر بنا دیا تھا کہ وہ اپنے ذاتی نماز روزے پر ہی قانع ہو کر رہ گئے تھے اور اسی کو کُل اسلام سمجھ بیٹھے تھے۔ اس صورتِ حال کا مرثیہ علامہ اقبال نے بایں الفاظ کھینچا ہے کہ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

''تکبیرِ رب'' جیسے ولولہ انگیز انقلابی تصور کو مسلمان نے تسبیح و وظائف تک محدود کر لیا تھا۔ اقبال نے بڑے زوردار انداز میں دین و مذہب کے اس محدود تصور پر ضرب لگائی اور نہایت دلنشیں پیرائے میں دین کے اصل تصور کو اجاگر کیا ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل — یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خُدا مست — یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

قرآن حکیم اور سنت رسول ﷺ کے مطالعے سے دینی فرائض کا جو جامع تصور ہمارے سامنے آتا ہے وہ تین نکات پر مشتمل ہے: (۱) ہم خود دین پر عمل پیرا ہوں' اس پر کاربند ہوں۔ (۲) دین کو پھیلائیں اور دوسروں کو اس پر عمل کی دعوت دیں۔ (۳) دین کو اجتماعی سطح پر قائم کرنے کی کوشش کریں — ان تین فرائض کے لیے قرآن حکیم میں کئی اصطلاحات وارد ہوئی ہیں جن میں سے جامع ترین (۱) عبادتِ رب' (۲) شہادت علی الناس' اور (۳) اقامتِ دین ہیں۔ قرآن حکیم میں دین کو قائم کرنے کی زوردار دعوت دی گئی ہے اور اس کے لیے متنوع اسالیب اور مختلف اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔ سورۃ التوبہ' سورۃ الصف اور سورۃ الفتح میں ''اظہارُ دینِ الحقّ علی الدِّین کُلِّہ'' کی اصطلاح وارد ہوئی ہے۔ سورۃ المدثّر میں ''تکبیرِ رب'' کا حکم ہے: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ''اور اپنے رب کی بڑائی کرو!'' — اقامتِ دین کی اصطلاح سورۃ الشوریٰ میں وارد ہوئی ہے: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (آیت ۱۳) ''یہ کہ دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ!'' چوتھی اصطلاح سورۃ الانفال اور سورۃ البقرۃ میں بیان ہوئی ہے' جو سورۃ الانفال میں زیادہ کامل شکل میں آئی ہے: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹) ''اور ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ و فساد بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل صرف اللہ کے لیے ہو جائے''۔ اس ضمن میں حدیثِ نبویؐ کی ایک اور اصطلاح اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں: ((لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا)) (صحیح البخاری) ''تاکہ اللہ کی بات سب سے اونچی ہو جائے''۔ یہی مفہوم انجیل میں ''آسمانی بادشاہت'' کی اصطلاح میں بیان ہوا ہے۔

گزشتہ صدی میں برعظیم پاک و ہند میں ہمارے جن اَسلاف نے دین اسلام اور اس کے تقاضوں کا جامع تصور پیش کیا ان میں سب سے نمایاں نام علامہ اقبالؒ کا ہے' جن کا ذکر

سطورِ گزشتہ میں ہوا۔ اسی دور میں مولانا ابوالکلام آزادؒ نے غلبۂ دین کے لیے ’’حکومتِ الٰہیہ کا قیام‘‘ کی اصطلاح اختیار کی۔ یہی اصطلاح پھر مولانا مودودیؒ نے اپنائی اور اسی زمانے میں علامہ مشرقی اور خیری برادران نے بھی یہی ’’حکومتِ الٰہیہ کا قیام‘‘ کی اصطلاح اپنائی‘ یعنی اللہ کی حکومت قائم ہو جائے۔ پھر جماعت اسلامی میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اس کی جگہ ’’اقامتِ دین‘‘ کی اصطلاح متعارف کرائی‘ جو اس قدر مقبول ہوئی کہ پھر ’’حکومتِ الٰہیہ کے قیام‘‘ کی اصطلاح کو ترک کر دیا گیا۔ جب جماعت اسلامی نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا تو زیادہ عام فہم اصطلاح ’’قیامِ نظامِ اسلامی‘‘ استعمال کی۔ پھر ہمارے ہاں ۱۹۷۷ء میں پاکستان قومی اتحاد نے بھٹو صاحب کے خلاف تحریک چلائی اور جب اس کے اندر دینی جذبہ پیدا ہوا تو اسے ’’تحریکِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ‘‘ کا نام دے دیا گیا۔ اس دور میں ان اصطلاحات میں ’’اسلامی انقلاب‘‘ اور ’’رب کی دھرتی‘ رب کا نظام‘‘ کا اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے کہ ہر دور میں ابلاغ کے لیے نئی اصطلاحات کی ضرورت پیش آتی ہے۔

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی فضل و کرم اور انعام و احسان ہوا کہ اس درویشِ خدامست نے دورِ حاضر میں اُمتِ مُسلمہ کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے ایک طرف رجوع الی القرآن کی تحریک چلائی اور دوسری طرف قرآن حکیم پر غور وتدبر کے نتیجے میں حاصل ہونے والے دینی فرائض کے جامع تصور کو نہ صرف عام کیا اور سنت وسیرتِ رسول ﷺ کی روشنی میں ان فرائض کے لوازم اور تقاضوں کو واضح کیا‘ بلکہ ان دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے ایک اسلامی انقلابی جماعت ’’تنظیم اسلامی‘‘ بھی قائم کی۔

’’تنظیم اسلامی‘‘ مروّجہ مفہوم کے اعتبار سے نہ کوئی سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ‘ بلکہ ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت ہے‘ جو اوّلاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں ’’دینِ حق‘‘ یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت کو قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ رفقاءِ تنظیمِ اسلامی پر الحمدللہ‘ دین کا جامع تصور بھی واضح ہوا ہے اور انہیں اپنے دینی فرائض کا شعور بھی حاصل ہوا ہے‘ اور وہ انہی دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے تنظیم میں شامل ہوئے ہیں۔ تنظیمِ اسلامی اسی حقیقی اسلامی فکر کو عام کر رہی ہے کہ ہمارا دین نماز‘ روزہ‘ حج‘ زکوٰۃ تک محدود نہیں ہے‘ بلکہ زندگی کے ہر گوشے کا نہ صرف احاطہ کرتا ہے بلکہ تفصیلی راہنمائی بھی فراہم کرتا ہے۔ ایک

مسلمان سے مطلوب یہ ہے کہ وہ اپنی پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں دینِ اسلام کی تعلیمات اور اصولوں کے مطابق بسر کرے۔

اس حقیقی اسلامی فکر کو وسیع پیمانے پر عام کرنے کے لیے ’’تنظیم اسلامی‘‘ کی ’’دعوتِ فکر اسلامی مہم‘‘ جاری ہے۔ ماہنامہ ’’میثاق‘‘ جسے تنظیم اسلامی کی انقلابی دعوت کے نقیب اور غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کے حُدی خواں کی حیثیت حاصل ہے‘ اس دعوتی مہم کے سلسلے میں خصوصی مضامین شائع کر رہا ہے۔ چنانچہ اس سہ ماہی مہم کے آغاز پر ماہِ اگست کے شمارے میں اس مہم سے متعلق امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ کا رفقاءِ تنظیم کے نام پیغام شائع کیا گیا۔ پھر ماہِ ستمبر کے شمارے میں بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی فکر انگیز تحریر ’’بدءُ الاسلام میں اسلام کی دو عظیم ترین حقیقتیں: قرآن حکیم اور جہاد فی سبیل اللہ‘‘ کے علاوہ دعوتِ دین اور آدابِ دعوت سے متعلق رفقاءِ تنظیم کے تین مضامین شاملِ اشاعت کیے گئے——اور اب پیشِ خدمت ہے ’’فریضۂ اقامتِ دین‘‘ سے متعلق مضامین پر مشتمل ’’میثاق‘‘ کی خصوصی اشاعت۔ اس اشاعت میں بانی محترمؒ کے دو مضمون شامل ہیں۔ ایک ’’مطالباتِ دین‘‘ کے ضمن میں تیسرا اہم تقاضا: ’’فریضۂ اقامتِ دین‘‘ اور دوسرے ’’تنظیم اسلامی شمالی امریکہ: ماضی‘ حال اور مستقبل‘‘، جس میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے دینی وتحریکی فکر کے دونوں رخ واضح کیے ہیں اور انہیں ایک حیاتیاتی وحدت قرار دیا ہے۔ دو سال قبل ملی یکجہتی کونسل کی مجلس قائدین کے اجلاس میں پیش کردہ امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ کا خصوصی مقالہ ’’ملکِ عزیز پاکستان میں سیکولرازم اور لبرل ازم کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے سدِّباب اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا ایک قابلِ عمل اور مؤثر طریق کار‘‘ بھی شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی معرکۃ الآراء تصنیف ’’دعوتِ دین اور اس کا طریق کار‘‘ کا ایک اہم باب ’’تبلیغ کس لیے؟‘‘ کا انتخاب خاص طور پر اس خصوصی اشاعت کے لیے کیا گیا ہے۔ انجینئر نوید احمدؒ اور شجاع الدین شیخ کے مضامین کے علاوہ عبدالسلام عمر صاحب کا علمی وتحقیقی مقالہ ’’فریضۂ اقامتِ دین: اَسلاف کی آراء وتعامل‘‘ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

قارئین کرام یہ بھی نوٹ فرما لیں کہ ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ’’میثاق‘‘ کی یہ خصوصی اشاعت ماہ اکتوبر و نومبر کے دو شماروں پر محیط ہے‘ لہٰذا آئندہ ماہ کا شمارہ شائع نہیں ہوگا۔ ❁❁❁

کربلا سے کشمیر تک

ایوب بیگ مرزا

شہادتِ حضرت حسین رضی اللہ عنہ اسلامی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس پر ہر مکتب فکر کے مسلمان تاسف اور اندوہ کا اظہار کسی نہ کسی انداز میں ضرور کرتے ہیں۔ جو لوگ بظاہر غم کا اظہار نہیں کرتے وہ بھی دل میں اس شہادت پر دکھ ضرور محسوس کرتے ہیں۔ لیکن وہ اہم ترین مقصد جس کے لیے اسلام کی عظیم ترین ہستیوں میں سے ایک ہستی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کے ساتھ ساتھ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں' نے تاریخ اسلام کی عظیم ترین قربانی پیش کی' اس مقصد کو سمجھنے اور اسے پورا کرنے کے لیے ہم میں سے کوئی بھی سنجیدہ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ شعر زبان زدِ عام ہے کہ: ''قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے —— اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد!'' لیکن اس بات پر سنجیدگی سے غور کرنے پر کوئی تیار نہیں ہوتا کہ اسلام میں ایسی کونسی بگاڑ کی صورت پیدا ہوگئی تھی جس کو درست کرنے اور صحیح نہج پر لانے کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے اہل وعیال سمیت اتنی بڑی قربانی پیش کی؟ حقیقت یہ ہے کہ آغاز میں اسلام کو قائم کرنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جو قربانیاں پیش کیں وہ باطل' کفر اور شرک کے خلاف تھیں۔ لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت تو ایک اسلامی مملکت میں ہوئی جس میں نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج سمیت تمام اسلامی عبادات و رسومات پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ چاہتے تو مسجد نبوی میں بیٹھ کر عبادت کر سکتے تھے۔ چاہتے تو خانہ کعبہ میں بیٹھ کر اللہ سے لو لگا سکتے تھے۔ اس حوالے سے ان پر کسی قسم کی کوئی پابندی پوری اسلامی ریاست میں کہیں بھی نہیں تھی۔ پھر آخر نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی بے مثل قربانی پیش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اگر اس معاملے پر کوئی عام شخص بھی غور کرے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ صرف اسلام کا سیاسی نظام تھا جس کے لیے تاریخ کی اتنی بڑی قربانی پیش کی گئی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ آج بھی معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو سانحہ کربلا پر اظہارِ افسوس

کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ سیاست یا سیاسی نظام کا اسلام سے کیا تعلق؟ گویا وہ ایک طرف آپؓ کی شہادت پر انہیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف اُس کام کی ہی نفی کرتے ہیں جس کی خاطر آپؓ نے قربانی دی۔

حقیقت میں آج ہم نے اسلام کو ایک دائرے کے اندر محدود کر لیا ہے اور اسے محض عبادات و رسومات کا ایک مجموعہ سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ اسلام تو ایک مکمل نظامِ حیات ہے جو زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی گوشوں پر محیط ہے۔ دین میں جس طرح انفرادی سطح پر عبادات و رسومات کی اہمیت ہے اتنی ہی اہمیت اجتماعی سطح پر اسلام کے معاشی' سیاسی اور معاشرتی نظام کی بھی ہے۔ یزید کے دور میں بھی اسلام زندگی کے تمام بقیہ انفرادی و اجتماعی گوشوں میں زندہ تھا' لیکن صرف سیاسی گوشے میں تبدیلی لائی گئی تھی کہ نظام خلافت کو ملوکیت میں بدل دیا گیا تھا۔ اسلام کے سیاسی گوشے یعنی نظام خلافت کی اہمیت کا اندازہ واقعہ کربلا سے ہوتا ہے کہ اس کے لیے اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی قربانی دی گئی۔ آج ہم شہادت حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے غم میں آنسو تو بہت بہاتے ہیں اور آپؓ سے محبت اور ہمدردی کا اظہار مختلف طور طریقوں سے ہر سطح پر کرتے ہیں' لیکن نظامِ خلافت کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھنے اور اُسے نافذ اور قائم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آج پوری دنیا میں ۵۸ اسلامی ممالک ہیں لیکن کسی ایک میں بھی اسلامی نظام قائم نہیں ہے۔ اسلام کو اگر ایک سات منزلہ عمارت سے تعبیر کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یزید کے دور میں اس عمارت کی ایک منزل گر گئی جسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے برداشت نہ کیا اور مع اہل وعیال جان قربان کر دی۔

آج یہ سات منزلہ عمارت مکمل طور پر گر کر ڈھیر ہو چکی ہے مگر اس پر دنیا کے پونے دو ارب مسلمانوں کو کوئی فکر نہیں ہے۔ حالانکہ یہی وہ فکر تھی جس کی خاطر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس قدر قربانیاں اور شہادتیں پیش کیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے عقیدت اور ہمدردی کے اظہار کا اصل تقاضا تو یہ ہے کہ جس مقصد کے لیے انہوں نے شہادت پیش کی ہم اس مقصد کو پورا کریں۔ لیکن عملاً صورت حال یہ ہے کہ آج نظامِ خلافت کا نام لینا بھی جرم بنا دیا گیا ہے۔ اگر دنیا میں چند لوگ اس نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کر بھی رہے تھے تو ماضی میں ہم نے عالمی طاقتوں کے ساتھ مل کر انہیں کچل ڈالنے کی پالیسی اپنائے رکھی۔ افغانستان کی مثال ہمارے سامنے ہے' جہاں دنیا کی واحد اسلامی حکومت قائم تھی' لیکن اس کو ختم کرنے کے لیے ہم نے اسلام دشمن قوتوں کی توقع سے بھی بڑھ کر کردار ادا کیا۔ ان اسلام دشمن عالمی قوتوں نے ''داعش'' جیسی تنظیمیں قائم کیں اور ان کے ذریعے ہر وہ کام کروایا گیا جس سے خلافت کا نام

بدنام ہو۔ گویا ہم نے حضرت حسین ؓ کے اس اعلیٰ وارفع مشن کو ہی بدنام کر دیا جس کے لیے انہوں نے قربانی پیش کی۔ آج ۱۰ محرم کو ٹی وی چینل، اخبارات اور سوشل میڈیا پر وہ لوگ سب سے زیادہ حضرت حسین ؓ سے محبت وعقیدت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں جو یہود و نصاریٰ سے بھی بڑھ کر نظام خلافت کا تمسخر اڑاتے نظر آتے ہیں۔ آج وہ بھی حضرت حسین ؓ کی محبت کے سب سے بڑے داعی ہیں جو کہتے ہیں کہ آج کے جدید دور میں ۱۴ سو سال پہلے کے نظام کی بات کرنا احمقوں کی جنت میں رہنا ہے۔ حالانکہ یہ سب لوگ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھیں تو وہ نظام خلافت ہی تھا جس کے لیے حضرت حسین ؓ نے اتنی بڑی قربانیاں اور شہادتیں پیش کیں۔ لہٰذا اگر ہم حضرت حسین ؓ سے محبت اور عقیدت میں مخلص ہیں تو ہمیں اُن کے اُس مشن کو سچے دل سے اپنا لینا چاہیے جس کے لیے آپؓ نے اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیا۔ جس طرح آپؓ نے کربلا میں نظام خلافت کے لیے قربانیاں پیش کر کے ایک مثال قائم کر دی اسی طرح آپؓ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمیں بھی نظامِ خلافت کے قیام کے لیے قربانیاں پیش کرنی چاہئیں، یا کم از کم جو لوگ اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کو شریعت کی بنیادوں پر قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں اُن کی راہ میں روڑے اٹکانے کی بجائے اُن کی مدد کرنی چاہیے۔

ہم نے یہ ملک حاصل ہی اس لیے کیا تھا کہ ہم یہاں پر اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کریں گے۔ ہمارا مقبول نعرہ تھا ”پاکستان کا مطلب کیا: لا الٰہ الا اللہ“۔ اسی مقصد کے لیے لاکھوں لوگوں نے قربانیاں دیں، اپنے گھر بار، کھیت کھلیان، روزگار، کاروبار سب کچھ چھوڑا، ہجرت کی اور دورانِ ہجرت تاریخ کے بدترین مصائب اُٹھائے اور عظیم ترین قربانیاں پیش کیں۔ ان سب لوگوں کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا کہ وہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور ان کا یہی خواب تھا کہ ان کی نسلیں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کے اندر رہتے ہوئے زندگیاں گزاریں گی۔ لیکن جب پاکستان بن گیا تو اس نظام کی جانب بڑھنے کی بجائے ہم نے اس جانب اُٹھنے والے ہر قدم کو روکنے کی کوشش کی۔ اگرچہ مذہبی طبقہ نے ابتدا میں دباؤ ڈال کر قرارداد مقاصد آئین ساز اسمبلی سے منظور کروائی، لیکن بعد ازاں اس کو آئین پاکستان کا باقاعدہ حصہ بنانے کی بجائے تمام تر کوششیں اسے غیر مؤثر کرنے میں صرف کی گئیں۔ اس کے بعد ایک بار پھر جب نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نعرے سے عوام کے دلوں کو گرمایا گیا تو پھر عوام نے قربانیاں پیش کیں، جیلیں کاٹیں اور سینوں پر گولیاں کھائیں، لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ نظامِ مصطفیٰؐ کی تحریک بھی سیاسی مقاصد کے لیے چلائی گئی تھی۔ یہ

درحقیقت اینٹی بھٹو تحریک تھی اور نظامِ مصطفیٰؐ کا لیبل عوام کو دھوکہ دینے کے لیے لگایا گیا تھا۔

حالیہ دور میں ایک بار پھر عوام کو ریاستِ مدینہ کا خواب دکھا کر اقتدار حاصل کیا گیا اور پاکستان کو ریاست مدینہ بنانے کے بلند و بانگ دعوے کیے گئے۔ لیکن ایک سال گزرنے کے باوجود حکومت نے ایک قدم بھی اس جانب نہیں بڑھایا۔ ۷۲ سال سے ہمارا معاشی نظام سود کی بنیاد پر کھڑا ہے۔ معاشرتی سطح پر بھی ہمارا نظام مغربی تہذیب کے گرداب میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔ عریانی، فحاشی، بے حیائی اپنے عروج پر ہے۔ اسی طرح سیاسی نظام میں سے بھی اسلام اور دین کو نکال باہر کر دیا گیا۔ ہمارا عدالتی نظام بھی انگریز کا بنایا ہوا نظام ہے جس میں غریب پھنس جاتا ہے جبکہ امیر کو ہر طرح سے چھوٹ مل جاتی ہے۔ اگرچہ شریعت کورٹس بنائی گئیں لیکن ان کا دائرہ کار اس قدر محدود کر دیا گیا کہ وہ باطل نظام پر کسی طرح سے بھی اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ اسی طرح ہماری مذہبی جماعتوں نے بھی ہمیشہ جمہوریت کے لیے تو تحریک چلائی ہے لیکن اسلامی نظام کے قیام کے لیے کبھی تحریک چلانے کی انہیں توفیق نہیں ہوئی۔ جبکہ حضرت حسین ؓ کا اُسوہ تو یہ تھا کہ اسلامی نظام میں صرف ایک دراڑ آئی تھی اور آپؓ نے اپنے اہل وعیال سمیت قربانی پیش کر دی۔

آج کشمیری بھی جس مقصد کے لیے قربانیاں پیش کر رہے ہیں وہ ان کے مقبول ترین نعرے سے خوب عیاں ہے کہ ”پاکستان سے رشتہ کیا: لا الٰہ الا اللہ“۔ حقیقت میں یہ رشتہ اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے جب پاکستان میں بھی عملی طور پر ”لا الٰہ الا اللہ“ قائم ہو گا۔ لیکن بالفرض کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ہو بھی گیا اور پاکستان میں اسی طرح باطل کا نظام قائم رہا، عدل وانصاف کا قتل عام ہوتا رہا، امیر اور غریب کے لیے الگ الگ قانون اور نظام رہا، فحاشی، عریانی اور بے حیائی کا بازار اسی طرح گرم رہا، اسلامی تہذیب کی بجائے مغربی تہذیب پروان چڑھتی رہی اور اسلام کی بجائے ہم سیکولرازم اور لبرل ازم کی طرف بڑھتے چلے گئے تو جس طرح آج کشمیری بھارت کے خلاف نعرے لگا رہے ہیں کل اسی طرح پاکستان کے خلاف بھی لگائیں گے۔ اس لیے کہ پاکستان کی طرح کشمیر بھی مضبوط اور مستحکم نہیں ہو سکے گا اور کشمیریوں کی دینی اور دنیاوی خواہشات اور توقعات پوری نہ ہو سکیں گی۔ وہ جس مقصد کے لیے قربانیاں دے رہے ہیں وہ پورا نہیں ہو گا تو لازماً انہیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک نئی جدوجہد کا آغاز کرنا پڑے گا، کیونکہ نماز، روزہ، حج تو وہ بھارت کے ساتھ رہ کر بھی کر سکتے تھے۔

اگر وہ بھارت سے آزادی چاہتے ہیں تو صرف اس لیے کہ انہیں اسلام کا عادلانہ سیاسی نظام چاہیے تاکہ وہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اپنی زندگیاں اسلام کے مطابق گزار سکیں۔ لہٰذا ہمارا کشمیر سے اور کشمیریوں سے رشتہ حقیقی معنوں میں تب ہی مضبوط اور گہرا ہوگا جب ہم پاکستان میں عملی طور پر ''لا الٰہ الا اللہ'' کو قائم کریں گے۔

اگر ہم اس پہلو پر سوچیں، غور وفکر کریں تو ہمیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بنیادی مقاصد بھی سمجھ میں آسکیں گے اور پھر جب ان مقاصد کو سمجھنے کے بعد ان کو پورا کرنے کی عملی جدوجہد ہماری زندگی کا مقصد بن جائے گی تو نہ صرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ہماری محبت اور عقیدت کے اصل تقاضے پورے ہوں گے بلکہ ہماری دعائیں بھی قبول ہوں گی، اللہ کی مدد اور نصرت بھی ہمیں حاصل ہوگی، جس کے بعد نہ صرف کشمیر پاکستان کا حصہ بنے گا بلکہ پاکستان بھی حقیقی معنوں میں مضبوط و مستحکم ہوگا۔

اس بات کا اعادہ اور تکرار ہم اس لیے کر رہے ہیں کہ جس مقصد کے لیے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا وہ مقصد اگر پورا ہوگا تو قوم میں وحدت آئے گی اور یہ وحدت پاکستانی قوم کو تمام صوبائی، نسلی اور لسانی تعصبات سے نکال کر ایک بار پھر متحد و منظم قوت بنا دے گی۔ اس لیے کہ اسلام پاکستان کے وجود کا واحد جواز ہے، وگرنہ ایک ہزار میل کے جغرافیائی فصل کو نظر انداز کر کے مشرقی اور مغربی بازوؤں پر مشتمل ایک ملک کیسے وجود میں آسکتا تھا؟ بنگالیوں کی زبان الگ، بود و باش الگ، اُن کی تہذیب اور تمدن تو اہل کلکتہ سے ملتا جلتا تھا، لیکن انہوں نے پٹھانوں، پنجابیوں، سندھیوں اور بلوچیوں سے الحاق کیا تو صرف اس لیے کہ ان سب کا مذہب ایک تھا۔ ان کے درمیان مذہب کی حیثیت وہی تھی جو اینٹوں کے درمیان سیمنٹ کی ہوتی ہے جب مذہب کا سیمنٹ ہم نے بیچ میں سے نکال دیا تو یہ اینٹیں کیسے اپنی جگہ پر قائم رہ سکتی تھیں؟ اسی غیر منطقی اور غیر فطری عمل نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا اور موجودہ پاکستان میں بھی اگر سندھو دیش کی باتیں ہو رہی ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم جوڑنے کے فطری عمل کی بجائے مصنوعی پیوندکاری کی کوشش کر رہے ہیں۔ اسلام کسی پیوندکاری کا قائل نہیں۔ قرآن پاک میں اللہ ربّ العزت ایمان کے دعوے داروں کو پورے کا پورا اسلام میں داخل ہونے کا حکم دیتا ہے، لہٰذا معاشرے اور ریاست کی سطح پر بھی جب مسلمان پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں گے تو دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوں گے۔ ان شاء اللہ!

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ حٰمٓ السَّجدۃ

آیات ۲۶ تا ۳۶

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰۗؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

اب اگلی آیت میں قرآن مجید کا ذکر بہت عظیم الشان انداز میں ہو رہا ہے:

آیت ۲۶ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ﴾ ''اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا کہ مت سنو اس قرآن کو اور اس (کی تلاوت کے دوران) میں شور مچایا کرو''

رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا آلہ اور ذریعہ چونکہ قرآن تھا اس لیے منکرینِ حق نے آپس میں ایک دوسرے کو یہ مشورہ دینا شروع کر دیا کہ جب محمد (ﷺ) قرآن پڑھا کریں تو تم لوگ اسے مت سنا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے دلوں پر اس کا اثر ہو جائے اور اس کی وجہ سے تم اپنے آبائی دین سے برگشتہ ہو جاؤ۔ اس لیے جب بھی وہ تمہیں قرآن سنانے کی کوشش کریں تم شور مچانا (hooting) شروع کر دیا کرو تا کہ اس کی آواز کسی کے کان میں نہ پڑے۔ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن مجید کی تلاوت چونکہ غیر معمولی تاثیر کی حامل تھی اور اس کی وجہ سے آپؐ کی دعوت کا پیغام تیزی سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہا تھا' اس لیے مشرکینِ مکّہ اس عمل کو روکنے کے لیے اپنے زعم میں گویا ایک جامع منصوبہ بندی کے ساتھ خم ٹھونک کر آپؐ کے مقابلے میں آ گئے۔

اس حوالے سے یہ نکتہ بھی اچھی طرح سے سمجھ لیجیے کہ قرآن کا پڑھنا پڑھانا' سننا سنانا اور سیکھنا سکھانا چونکہ شیطان پر بہت بھاری ہے اس لیے جہاں کہیں بھی یہ کام مؤثر انداز میں ہو رہا ہو گا شیطانی قوتیں اسے روکنے کے لیے اپنی پوری طاقت کے ساتھ میدان میں آ جائیں گی۔ البتہ اگر کہیں قرآن کا کوئی پروگرام محض رسمی انداز میں ہو رہا ہو' یعنی اس میں علمی اور عقلی سطح پر کوئی مؤثر پیغام لوگوں تک نہ پہنچ رہا ہو تو ایسی تقریبات' ٹی وی پروگرامز اور قرآنی سیمینارز پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ دورِ حاضر میں ٹی وی پروگرام ''الہدیٰ'' کی بندش اس کی زندہ مثال ہے۔ یہ پروگرام ''پی ٹی وی'' کا مقبول ترین ہفتہ وار دینی پروگرام تھا' جو بہت اہتمام کے ساتھ پورے ملک میں ایک ہی وقت پر ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا (اُس وقت ابھی کیبل نیٹ ورک کا آغاز نہیں ہوا تھا)۔ اس میں مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب پیش کیا جاتا تھا۔ جب یہ پروگرام بہت مؤثر انداز میں چلنا شروع ہوا اور قرآن کا اصل پیغام ایک تدریج اور منطقی ترتیب کے ساتھ گھر گھر پہنچنے لگا تو شیطانی قوتیں ''لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ'' کا نعرہ لگا کر سامنے آ کھڑی ہوئیں اور انہوں نے اس پروگرام کو بند کرا کے ہی دم لیا۔ یہ پروگرام اس حد تک مقبول ہوا تھا کہ بھارت میں بھی بڑے ذوق وشوق سے دیکھا جاتا تھا — بلکہ پی ٹی وی پر اس پروگرام کی بندش کے بعد یہ بھارت میں کیبل نیٹ ورک پر دکھایا جانے لگا تھا' بلکہ کبھی کبھی ''دور درشن'' پر بھی پیش کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ''پی ٹی وی'' پر میرے پروگراموں پر پابندی لگا دی گئی تھی۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝۴۶﴾ ''تا کہ تم غالب رہو۔''

ان کا آپس میں ایک دوسرے کے لیے یہی مشورہ تھا کہ اگر تم اپنی ''سیادت'' کو برقرار رکھنا چاہتے ہو تو خود کو اور اپنے عوام کو اس قرآن سے دور رکھو۔ بالکل یہی انداز منافقین کے اس مشورے میں بھی نظر آتا ہے جو انہوں نے غزوۂ احزاب کے موقع پر مدینہ کے عام لوگوں کو دینا شروع کیا تھا۔ ان کا مشورہ تھا: ﴿يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ﴾ (الاحزاب:۱۳) کہ اے اہل یثرب! تمہارے یہاں ٹھہرنے کی اب کوئی صورت نہیں ہے' لہٰذا اب تم واپس پلٹ جاؤ۔ بہر حال حضور ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن کے پیغام کو گھر گھر پہنچتے دیکھ کر مشرکین نے بجا طور پر محسوس کیا کہ اگر اس دعوت کو بروقت نہ روکا گیا تو پھر عرب کی سرزمین میں ان کے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں بچے گا۔

آیت ۲۷ ﴿فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا﴾ ''تو ہم لازماً مزہ چکھائیں گے ان کافروں کو بہت سخت عذاب کا''

یہ بہت سخت جواب ہے اور اس جملے کا اسلوب بھی بہت زوردار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ یہ میرا کلام ہے' اسے میں نے ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) کی حیثیت سے نازل فرمایا ہے۔ اگر یہ لوگ میری اس عظیم نعمت کو ٹھکرا رہے ہیں اور میرے بندوں تک اس کے ابلاغ کو روکنے کی سازشیں کر رہے ہیں تو میں انہیں اس بغاوت اور سرکشی کا مزہ ضرور چکھاؤں گا۔

﴿وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۴۷﴾ ''اور ہم انہیں سزا دیں گے ان کے بدترین اعمال کے حساب سے۔''

یعنی ان کی سزا معیّن کرتے ہوئے ان کے سب سے برے اعمال کو بطور ''معیار'' مدِنظر رکھا جائے گا۔

آیت ۲۸ ﴿ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ﴾ ''یہ ہے بدلہ اللہ کے دشمنوں کا (یعنی) آگ!''

یہ لوگ قرآن کے دشمن ہیں تو قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اس لیے یہ اللہ کے دشمن ہیں۔ اور اللہ کے دشمنوں کی سزا آتش دوزخ کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے!

﴿لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ﴾ ''ان کے لیے اسی میں ہمیشگی کا ٹھکانہ ہو گا۔''

﴿جَزَآءً ۢ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۲۸﴾ ’’یہ بدلہ ہوگا اس کا کہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے رہے تھے۔‘‘

آیت ۲۹ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ﴾ ’’اور جو کافر ہیں وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ذرا ہمیں دکھا دے جنوں اور انسانوں میں سے وہ لوگ جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا‘‘

وہاں جہنم میں بڑے بڑے سرداروں اور لیڈروں کے خلاف ان کے عوام واویلا کر رہے ہوں گے۔ وہ کہیں گے کہ اے پروردگار! اس وقت ہم ان لوگوں کو دیکھنا چاہتے ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ وہ لوگ جو ہمیں قرآن سننے سے روکتے رہے‘ جنہوں نے ہماری عقلوں پر پردے ڈال دیے تھے‘ جنہوں نے محمد (ﷺ) کے بارے میں ہمیں ورغلایا‘ ان کے بارے میں ہمارے دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کیے‘ اور ہمارے اور ان کی دعوت کے درمیان آڑ بن گئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس وقت انہیں ہمارے سامنے لایا جائے تا کہ:

﴿نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ۝۲۹﴾ ’’ہم انہیں اپنے قدموں کے نیچے روندیں‘ تا کہ وہ ہو جائیں سب سے نیچے والے۔‘‘

اگلی سات آیات اپنے مضمون کے لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ ’’مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب‘‘ کے پہلے حصے کا چوتھا درس انہی آیات پر مشتمل ہے۔ منتخب نصاب کے اس حصے میں چار جامع اسباق ہیں اور ان چاروں اسباق یا دروس میں مضمون کے اعتبار سے ایک خاص ترتیب اور تدریج پائی جاتی ہے۔ ان میں پہلا درس سورۃ العصر پر مشتمل ہے: ﴿وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳﴾۔ یہ سورت قرآن حکیم کی تین مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں اُخروی نجات کے لیے چار شرائط بیان کی گئی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا درس آیت البر (سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷) پر مشتمل ہے۔ اس آیت میں وہی چار نکات قدرے وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جن کا ذکر سورۃ العصر میں ہوا ہے۔ تیسرے درس کے لیے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کو منتخب کیا گیا ہے۔ اس رکوع میں یہی مضمون ذرا مختلف انداز میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحتوں کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ اس طرح سورۃ العصر کا مضمون ایک خاص ترتیب اور تدریج کے ساتھ چوتھے درس (زیر مطالعہ سورت کی آیات ۳۰ تا ۳۶)

میں اپنے نقطہ عروج تک پہنچ گیا ہے۔ چنانچہ ان سات آیات کے اندر آپ کو سورۃ العصر کے چاروں موضوعات (ایمان‘ اعمالِ صالحہ‘ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر) میں سے ہر ایک کی چوٹی نظر آئے گی‘ اور پھر انہی سات آیات کے عین درمیان میں وہ آیت بھی (آیت ۳۳) آئے گی جو اس سورت کا عمود ہے۔ اس آیت کی مثال ایک بہت بڑے ہیرے کی سی ہے جو ان سات آیات کے خوبصورت ہار کے عین وسط میں اپنی خصوصی آب وتاب کے ساتھ جگمگا رہا ہے۔ اس تمہید کے بعد آیئے اب ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

آیت ۳۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ ’’بیشک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے‘‘

اللہ پر ایمان لانا آسان ہے مگر اس پر جمے رہنا آسان نہیں ہے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب انسان کو اللہ پر پوری طرح توکّل ہو‘ وہ ہر حالت میں اس کی رضا پر راضی رہے۔ نہ اپنی کسی حالت کے بارے میں اس کی زبان پر حرفِ شکایت آئے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے کسی فیصلے پر اس کے دل میں ملال پیدا ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کے آگے اس کا سر تسلیم بلاحیل وحجت جھکتا چلا جائے اور وہ اپنے تَن مَن دھن کو ہتھیلی پر رکھے‘ اس کے در اطاعت پر ہمہ وقت کمربستہ کھڑے رہ کر عملی طور پر ثابت کر دے کہ: ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶۲﴾ (الانعام) ’’یقیناً میری نماز‘ میری قربانی‘ میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے‘‘۔ اس استقامت کی اہمیت ایک حدیث سے بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ حضرت سفیان بن عبداللہ ؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: ’’یارسول اللہ! مجھے اسلام کے بارے میں ایسی بات بتا دیں کہ آپؐ کے سوا کسی اور سے کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہ رہے۔‘‘ (یعنی مجھے اسلام کی حقیقت ایک جملے میں بتا دیجیے تا کہ میں اسے گرہ میں باندھ لوں۔) جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ))(۱) ’’کہو میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ!‘‘ اگر واقعی کوئی شخص غور کرے تو

---

(۱) مسند احمد‘ کتاب مسند المکیین‘ باب حدیث سفیان بن عبداللہ الثقفی‘ ح: ۱۴۸۶۹۔ یہ حدیث صحیح مسلم (کتاب الایمان) میں ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰهِ فَاسْتَقِمْ)) کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے‘ جبکہ امام ترمذی اور امام ابن ماجہ کی نقل کردہ روایت میں الفاظ یہ ہیں: ((قُلْ رَبِّيَ اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) ’’کہو میرا رب اللہ ہے اور پھر اس پر جم جاؤ!‘‘

اس استقامت میں اسے قیامت مضمر دکھائی دے گی۔ (واضح رہے کہ استقامت اور قیامت کا سہ حرفی مادہ ایک ہی ہے۔) یہ قیامت ہی تو ہے کہ ایک بندہ اللہ تعالیٰ کو نظریاتی طور پر اپنا ربّ مان لینے کے بعد عملی طور پر ساری دنیا سے بے نیاز ہو جائے اور اپنے ایک ایک عمل سے ثابت کر دے کہ میرا پروردگار‘ میرا حاجت روا‘ میرا سہارا‘ میرا مشکل کشا‘ میرے نفع ونقصان کا مالک صرف اور صرف اللہ ہے۔ دل کا یہ یقین اور عمل کا یہ رنگ گویا چوٹی ہے اس ایمان اور عمل صالح کی جس کا ذکر سورۃ العصر میں نجاتِ اُخروی کی پہلی دو شرائط کے طور پر اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کے الفاظ میں ہوا ہے۔

اب اگلی آیت میں ان خوش قسمت لوگوں کا اللہ کے ہاں مقام ملاحظہ کیجیے جو اپنی دُنیوی زندگی میں ایمان وعمل کی اس چوٹی یعنی استقامت تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں:

﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝۳۰﴾ ’’ان پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے کہ آپ لوگ ڈرو نہیں اور غمگین نہ ہو اور خوشیاں مناؤ اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے۔‘‘

فرشتوں کا نزول ان لوگوں پر کب ہوتا ہے؟ اس حوالے سے یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ موت کے قریب ایسے لوگوں کو خوش آمدید کہنے اور بشارت دینے کے لیے فرشتے نازل ہوتے ہیں‘ لیکن دُنیوی زندگی کے دوران بھی اہل ایمان کی مدد کے لیے فرشتوں کا آنا ثابت ہے۔ جیسے میدانِ بدر میں اہلِ ایمان مجاہدین کی مدد کے لیے فرشتے نازل ہوئے: ﴿اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ﴾ (الانفال:۱۲) ’’(یاد کریں) جب آپؐ کا ربّ وحی کر رہا تھا فرشتوں کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں‘ تو تم (جاؤ اور) اہلِ ایمان کو ثابت قدم رکھو‘‘۔ چنانچہ مؤمنین صادقین پر ملائکہ کا نزول اثنائے حیات میں بھی ہوتا ہے۔

آیت ۳۱ ﴿نَحْنُ اَوْلِيٰۗؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ ’’ہم ہیں تمہارے رفیق دُنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔‘‘

ان الفاظ سے یہ مفہوم خود بخود واضح ہو رہا ہے کہ فرشتے حیاتِ دُنیوی کے دوران بھی ان خوش قسمت لوگوں کی ہمت بندھاتے ہیں اور انہیں یہ پیغامِ جانفزا پہنچاتے ہیں۔

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ﴾ ’’اور تمہارے لیے اس (جنت) میں وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارے جی چاہیں گے‘‘

تمہارے جی وہاں جو کچھ چاہیں گے وہ سب کچھ ہمارے علم میں ہے‘ کیونکہ تمہارے نفسوں کے تقاضوں اور تمہاری خواہشات کو بھی ہم نے خود ہی پیدا کیا ہے۔ لہٰذا ہم تمہاری خواہشات کی تسکین کا مکمل سامان وہاں فراہم کریں گے۔

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝۳۱﴾ ’’اور تمہارے لیے اس میں وہ سب کچھ بھی ہوگا جو تم مانگو گے۔‘‘

تمہارے نفسوں کے تقاضوں کے مطابق تو سب کچھ وہاں پہلے سے ہی مہیا ہو چکا ہوگا۔ البتہ مانگنے اور طلب کرنے کے حوالے سے ہر شخص کا اپنی ذہنی سطح کے مطابق ایک معیار اور مخصوص ذوق ہوتا ہے۔ بچہ اپنی پسند کی کوئی چیز مانگے گا‘ ایک سادہ لوح دیہاتی اپنے معیار کی کوئی چیز طلب کرے گا‘ جبکہ ایک حکیم وفلسفی اپنے ذوق کے مطابق سوال کرے گا۔ غرض جو کوئی جو کچھ مانگے گا وہ سب کچھ اس کے سامنے حاضر کر دیا جائے گا۔

آیت ۳۲ ﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ۝۳۲﴾ ’’یہ ابتدائی مہمان نوازی ہوگی اُس ہستی کی طرف سے جو غفور اور رحیم ہے۔‘‘

جنت کی جن نعمتوں کا ذکر ہمیں قرآن وحدیث میں ملتا ہے ان کا تعلق اہل جنت کی ابتدائی مہمان نوازی (نُـــزُل) سے ہے۔ جہاں تک ان کی اصل ضیافت کا تعلق ہے اس کی کیفیت ہمارے احاطہ شعور میں نہیں آ سکتی۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ: اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ .....))[1] ’’اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا‘ نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا گمان ہی گزرا.....‘‘ پھر آپ ﷺ نے سورۃ السجدۃ کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۷﴾ ’’پس کوئی انسان نہیں جانتا کہ ان (اہل جنت) کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کچھ چھپا کر رکھا گیا ہے‘ وہ بدلہ ہوگا ان کے اعمال کا۔‘‘

اب اس کے بعد وہ آیت آ رہی ہے جو اپنے مضمون کے اعتبار سے اس سورت کا عمود ہے اور

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الخلق‘ باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها۔ واللفظ له۔

جس کو قبل ازیں ان سات آیات کے ہار کے درمیان ایک جگمگاتے ہیرے سے تشبیہہ دی گئی تھی۔

آیت ۳۳ ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ﴾ ''اور اُس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہوگی جو بلائے اللہ کی طرف''

جس خوش قسمت شخص کو ایمان کے بعد ''استقامت'' کا مقام حاصل ہو چکا ہو' اسے بھلا اب کس بات کی دھن ہوگی؟ کیا وہ اب بھی مال و دولتِ دنیا کے پیچھے دوڑے گا؟ یا کیا حکومت اور اقتدار کے حصول کی خواہش اب بھی اس کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچے گی؟ نہیں! ہرگز نہیں! اس ''متاعِ غرور'' کو تو وہ ٹھکرا کر بہت آگے نکل آیا ہے۔ مسندِ استقامت پر رونق افروز ہونے کے بعد دنیا و مافیہا کے بارے میں اس کی ترجیحات بہت واضح ہو چکی ہیں۔ اب تو وہ خوب سمجھتا ہے کہ یہ سب آنی جانی چیزیں ہیں' آج ہیں تو کل نہیں ہیں۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ دنیا اور اس کے لوازمات کی بہتات سے مسئولیت بڑھتی ہے اور حسابِ آخرت مشکل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب اس کے دل میں ایک ہی تڑپ ہے اور وہ ہے دعوت الی اللہ کی تڑپ۔ اب اس کی دوڑ دھوپ اور جدّوجُہد کا اگر کوئی ہدف ہے تو بس یہی کہ میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو راہِ ہدایت پر لے آؤں۔

﴿وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۳﴾ ''اور وہ نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔''

اعمالِ صالحہ کا مفہوم ''استقامت'' کے اندر بھی پوشیدہ ہے' لیکن یہاں پر اس کا علیحدہ ذکر بھی آ گیا ہے' اس لیے کہ دعوت الی اللہ اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ایک داعی کا اپنا عمل درست نہیں ہوگا تو نہ صرف یہ کہ اس کی دعوت مؤثر نہیں رہے گی بلکہ وہ دعوت کی بدنامی کا باعث بھی بنے گا۔

آیت ۳۴ ﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ﴾ ''اور (دیکھو!) اچھائی اور برائی برابر نہیں ہوتے۔''

اب کون کہے گا کہ یہ دونوں برابر ہیں۔ چنانچہ بات اس نکتے سے شروع کی جا رہی ہے جو سب کے ہاں متفق علیہ اور مسلّم ہے۔

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ ''تم مدافعت کرو بہترین طریقے سے''

لوگ بے شک آپ کو گالیاں دیں' مگر آپ انہیں دعائیں دو' اگر کوئی آپ کو پتھر مارے تو

آپ جواب میں اسے پھول پیش کرو۔ یہ وہ حکمت عملی ہے جو کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ اس طرزِ عمل کے سامنے بڑے سے بڑا کٹھور دل انسان بھی نرم پڑ جاتا ہے۔ یہاں اس مضمون کے حوالے سے یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اگلی سورت یعنی سورۃ الشوریٰ میں اس تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آئے گا۔ لیکن یاد رہے کہ سورۃ الشوریٰ میں سختی کا جواب سختی سے دینے کی بات اقامتِ دین کے حوالے سے ہوئی ہے جبکہ یہاں دعوتِ دین کے مرحلے کی حکمت عملی بتائی جا رہی ہے۔ دونوں مرحلوں پر پالیسی کے اس فرق کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ بہرحال ''دعوت'' کے مرحلے کی پالیسی یہی ہے کہ جب تم دعوت کو لے کر چلو تو ایسے بے ضرر انسان بن جاؤ کہ بدھ مت کے بھکشو نظر آؤ۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے اسی حکمت عملی کے بارے میں فرمایا تھا کہ تم سانپ کی مانند چوکنے اور فاختہ کی طرح بے ضرر بنو! یعنی ایک داعی کو ایسا احمق اور بدھو نہیں ہونا چاہیے کہ دوسرے اسے ضرر پہنچا جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ خود اُس کی ذات سے کسی دوسرے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس حوالے سے رسالت مآب ﷺ کی سیرت ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ نے گالیاں دینے والوں کو ہمیشہ دعائیں دیں' بلکہ آپؐ نے تو ابوجہل جیسے دشمنوں کی ہدایت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں ؎

سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
سلام اُس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں!

زیرِ مطالعہ موضوع یعنی ''دعوتِ توحید'' کی اہمیت کو اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے حوالے سے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ توحید عملی کے تدریجی مراحل کو اپنے ذہن میں ایک مرتبہ پھر سے تازہ کر لیں۔ اب تک ہم انفرادی سطح پر توحید عملی کے دو پہلوؤں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ سورۃ الزمر میں توحید کا خارجی یا ظاہری پہلو بیان ہوا ہے کہ عبادت صرف اللہ کی کرو اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ اس کے بعد سورۃ المؤمن میں توحید کے داخلی پہلو کا ذکر آیا تھا کہ دعا صرف اللہ سے کرو' اور وہ بھی اُس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔ اب سورۂ حٰمٓ السجدہ میں توحید کو انفرادی سطح سے اجتماعیت کی طرف بڑھانے کی بات ہو رہی ہے۔ گویا ''توحید'' ایک فرد سے نکل کر دوسرے افراد تک پہنچنا شروع ہوگی اور دعوت کے ذریعے ''متعدی'' صورت اختیار کر کے معاشرے میں پھیلتی چلی جائے گی۔ سورۂ آل عمران میں اس بنیاد پر باقاعدہ ایک جماعت قائم کرنے کی ضرورت اور اہمیت ان الفاظ میں بیان

فرمائی گئی ہے: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۱۰۴﴾ ''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے' نیکی کا حکم دیتی رہے اور بدی سے روکتی رہے۔ اور یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

بہر حال زیر مطالعہ آیات کا موضوع دعوتِ توحید ہے اور اس حوالے سے داعیانِ حق کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم برائی کا جواب ہمیشہ نیکی اور خوش اخلاقی سے دو۔ اگر تم یہ روش اختیار کرو گے:

﴿فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۳۴﴾ ''تو (تم دیکھو گے کہ) وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے وہ گویا گرم جوش دوست بن جائے گا۔''

انسان آخر انسان ہے۔ اگر کوئی شخص ہر وقت آپ کی مخالفت پر ہی کمر بستہ ہے اور آپ ہیں کہ ہمیشہ اُس کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں تو آخر وہ کب تک اپنے منفی طرزِ عمل پر کاربند رہے گا۔ بالآخر اسے آپ کے اخلاق کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑیں گے۔

آیت ۳۵ ﴿وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ﴾ ''اور یہ مقام نہیں حاصل ہو سکتا مگر ان ہی لوگوں کو جو بہت صبر کرتے ہوں۔''

اس خاص مقام تک صرف وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جن میں صبر کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہو اور وہ اپنی عملی زندگی میں بھی ہمیشہ صبر کی روش پر کاربند ہوں۔

﴿وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۳۵﴾ ''اور یہ نہیں دیا جاتا مگر ان ہی کو جو بڑے نصیب والے ہوں۔''

یہ حَظٍّ عَظِیْم کیا ہے اور اس کا حقیقی معیار کیا ہے؟ ہر انسان کے لیے اس کا صحیح ادراک حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ ہم سورۃ القصص کے آٹھویں رکوع میں قارون کے حوالے سے بھی پڑھ آئے ہیں۔ قارون کے ٹھاٹھ باٹھ اور خدم و حشم سے متاثر ہو کر دنیادار لوگوں نے حسرت بھرے انداز میں کہا تھا: ﴿اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۷۹﴾ (القصص) کہ یقیناً یہ شخص بڑا صاحبِ نصیب ہے۔ لیکن پھر جب وہ اپنے گھر بار سمیت زمین میں دھنسا دیا گیا تو ان ہی لوگوں نے اس پر شکر و اطمینان کا اظہار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بڑی مہربانی کی کہ

انہیں قارون جیسا مال و منال نہ دیا' ورنہ انہیں بھی اسی طرح زمین میں دھنسا دیا جاتا۔ چنانچہ ایک بندۂ مؤمن کے لیے اصل کامیابی' حقیقی فوز و فلاح اور ''حظِ عظیم'' اسی عمل اور اسی کردار میں ہے جس کی نشاندہی اس آیت میں کی گئی ہے۔

آیت ۳۶ ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ﴾ ''اور اگر کبھی تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی چوک لگنے لگے تو اللہ کی پناہ طلب کر لیا کرو۔''

اگر کبھی کسی کے ناروا سلوک اور مخالفانہ رویے پر غصہ آ جائے تو فوراً سمجھ لو کہ یہ شیطان کی اُکساہٹ ہے' شیطان تم پر حملہ آور ہوا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایسی کیفیت میں فوراً اللہ کی پناہ طلب کر لیا کرو' کیونکہ صرف اسی کی پناہ میں آ کر تم شیطان کے وار سے بچ سکتے ہو۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۳۶﴾ ''یقیناً وہی ہے سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا۔''

یہ آیت سورۃ الاعراف (آیت ۲۰۰) میں بھی آ چکی ہے۔ وہاں ﴿اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ کے الفاظ ہیں۔ گویا یہاں اللہ تعالیٰ کی مذکورہ صفات (السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ) کے بارے میں زیادہ زور اور تاکید کا انداز پایا جاتا ہے۔

آیات ۳۷ تا ۴۶

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۳۷ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْــَٔـمُوْنَ ۳۸ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۭ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۳۹ اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۴۰ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۴۱ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۴۲ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ

قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ۝ وَلَوْ
جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ
لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ
عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى
الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ
وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ
فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

آیت ۳۷ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ؕ﴾ ''اور اسی کی نشانیوں میں سے ہیں رات' دن' سورج اور چاند۔''

﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ﴾ ''تم سورج کو سجدہ مت کرو اور نہ چاند کو'

﴿وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝۳۷﴾ ''بلکہ اُس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا' اگر تم واقعتاً اُسی کی بندگی کرتے ہو۔''

آیت ۳۸ ﴿فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا
يَسْـَٔمُوْنَ ۝۳۸﴾ ''پس (اے نبی ﷺ!) اگر وہ استکبار کریں تو (پروا نہیں) وہ جو آپ کے رب کے پاس ہیں وہ دن رات اُس کی تسبیح میں لگے ہوئے ہیں اور وہ (اس سے) تھکتے نہیں۔''

اگر یہ لوگ تکبّر کی بنا پر مجھے سجدہ کرنے کو تیار نہیں تو مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس تو فرشتوں کی فوجیں ہیں جو دن رات مسلسل میری تسبیح اور حمد میں لگے رہتے ہیں۔ اس بارے میں فرشتوں کا یہ بیان ہم سورۃ البقرہ کی آیت ۳۰ میں پڑھ چکے ہیں: ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ﴾ ''اور ہم آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔''

آیت ۳۹ ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً﴾ ''اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تم زمین کو دیکھتے ہو کہ وہ دبی پڑی ہے''

یعنی زمین کی وہ کیفیت کہ جب وہ بنجر اور ویران ہوتی ہے اور اس پر روئیدگی وغیرہ کا نام

ونشان تک نہیں ہوتا۔

﴿فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ؕ﴾ ''پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو اس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور وہ اُبھر آتی ہے۔''

بارش کے برستے ہی زمین سے طرح طرح کے نباتات اگنے لگتے ہیں جیسے کہ مردہ زمین میں جان پڑ گئی ہو۔

﴿اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۳۹﴾ ''یقیناً وہ (اللہ) جس نے اس کو زندہ کیا ہے وہی مُردوں کو بھی زندہ کرے گا۔ یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ؕ﴾ ''جو لوگ ہماری آیات کے بارے میں کج روی اختیار کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔''

﴿اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ ''تو کیا وہ شخص جو آگ میں جھونک دیا جائے گا وہ بہتر ہوگا یا وہ کہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں آئے گا!''

﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴۰﴾ ''تم کیے جاؤ جو بھی کرنا چاہتے ہو' وہ خوب دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

قبل ازیں ہم آیت ۵ میں مشرکین کی طرف سے حضور ﷺ کے لیے اس کھلے چیلنج کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا: فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ کہ آپ جو کرنا چاہتے ہیں کر لیں' ہم بھی آپ کی ہر کوشش کا توڑ کریں گے اور آپ کی اس دعوت کو چلنے نہیں دیں گے۔ زیر مطالعہ جملے میں دراصل اسی چیلنج کا جواب ہے۔

آیت ۴۱ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اس یاددہانی کا انکار کیا جبکہ یہ ان کے پاس آ گئی۔''

اس سے آگے اس مفہوم کے الفاظ محذوف ہیں کہ ''اب ان لوگوں کی شامت آنے والی ہے''۔ نوٹ کیجیے کہ اس سورت میں یہاں تیسری مرتبہ قرآن کا ذکر آیا ہے۔ (اس سے پہلے آیت ۳ اور آیت ۲۶ میں بھی قرآن کا ذکر آ چکا ہے۔) یہاں قرآن کو ''الذکر'' یعنی یاددہانی

قرار دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب تو اس گواہی کو اُجاگر کر کے تمہارے سامنے لا رہی ہے جو پہلے سے تمہاری فطرت کے اندر مخفی ہے۔ اللہ کی معرفت اور اس کی محبت تو تمہاری ارواح کے اندر پہلے سے موجود تھی لیکن تمہاری عدم توجہی کی وجہ سے اس معرفت پر غفلت اور ذہول کے پردے پڑ گئے تھے‘ جس کے نتیجے میں تم اپنی فطرت کی اصل پہچان کو بھول کر اللہ ہی کو بھول گئے تھے۔ سورۃ الحشر کی آیت ۱۹ میں اہل ایمان کو اسی حوالے سے تاکید کی گئی ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ کہ اے اہل ایمان! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو نتیجتاً اللہ نے انہیں ایسا کر دیا کہ وہ خود اپنے آپ ہی کو بھول گئے۔ چنانچہ یہاں قرآن کو ’’الذکر‘‘ کہہ کر گویا اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ کتاب انسانی فطرت میں مضمر معرفتِ خداوندی کے ابدی سبق کی یاد دہانی کے لیے آئی ہے۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے اس یاد دہانی کا انکار کر دیا ہے اب ان کی شامت آنے والی ہے۔

﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝۴۱﴾ ’’(انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ) بلاشبہ یہ ایک زبردست کتاب ہے۔‘‘

آیت ۴۲ ﴿لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ﴾ ’’باطل اس پر حملہ آور ہو ہی نہیں سکتا‘ نہ اس کے سامنے سے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے۔‘‘

اس دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران بار بار میں مثالیں دیتا رہا ہوں کہ قرآن کس طرح اپنی حفاظت کرتا ہے اور کس طرح ان لوگوں کے عزائم کو ناکام بناتا ہے جو اس کی آیات کو اپنے مفادات کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں یا کسی آیت کی تعبیر اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝۴۲﴾ ’’اس کا اتارا جانا ہے ایک حکیم اور حمید ہستی کی طرف سے۔‘‘

آیت ۴۳ ﴿مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) نہیں کہا جاتا آپ سے مگر وہی کچھ جو آپ سے پہلے رسولوں سے کہا گیا تھا۔‘‘

﴿اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ۝۴۳﴾ ’’یقیناً آپ کا رب مغفرت والا بھی ہے اور دردناک سزا دینے والا بھی۔‘‘

آیت ۴۴ ﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا﴾ ’’اور اگر ہم نے اسے عجمی قرآن بنایا ہوتا‘‘

نوٹ کیجیے یہ پانچویں مرتبہ قرآن کا ذکر آیا ہے اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ اگر ہم نے اس قرآن کو عربی زبان کے بجائے کسی عجمی زبان میں نازل کیا ہوتا:

﴿لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ﴾ ’’تو یہ کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں کی گئیں!‘‘

﴿ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ﴾ ’’کیا کتاب عجمی اور مخاطب عربی؟‘‘

ایسی صورت میں اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا تھا کہ جس کتاب کی اولین مخاطب ایک عربی قوم ہے وہ خود کسی اور زبان میں ہے!

﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ یہ ہدایت اور شفا ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔‘‘

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ﴾ ’’اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے‘‘

﴿وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ﴾ ’’اور یہ (قرآن) ان کے حق میں اندھاپن ہے۔‘‘

یعنی یہ لوگ قرآن کی حقیقت کو نہیں دیکھ پا رہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ۝۴۴﴾ ’’یہ وہ لوگ ہیں جو پکارے جاتے ہیں بہت دور کی جگہ سے۔‘‘

انہیں قرآن کی باتیں عجیب اور نامانوس لگتی ہیں۔ قرآن کی تعلیمات کے بارے میں انہیں ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں کوئی بہت دور سے پکار رہا ہو۔

آیت ۴۵ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ﴾ ’’اور ہم نے موسیٰؑ کو بھی کتاب دی تھی‘ تو اس میں بھی اختلاف کیا گیا۔‘‘

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ﴾ ’’اور اگر آپ کے رب کی طرف سے ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کے مابین فیصلہ کر دیا جاتا۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی تقویم میں ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے‘ اسی طرح ان کے فیصلے کا بھی اللہ تعالیٰ نے ایک وقت طے کر رکھا ہے۔ اگر یہ وقت پہلے سے طے نہ ہوتا تو ان کا فیصلہ اب تک چکا دیا جاتا۔

﴿وَاِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۴۵﴾﴾ ''اور یقیناً وہ اس کے بارے میں خلجان انگیز شک میں مبتلا ہیں۔''

یہاں مِنْهُ سے مراد قرآن مجید ہے۔ یعنی پہلے انہوں نے خواہ مخواہ اختلافات کھڑے کیے۔ لیکن جب ہم نے ان اختلافات کی وضاحت کے لیے یہ کتاب بھیج دی تو اب وہ اس کے بارے میں ایسے شک وشبہ میں مبتلا ہو گئے ہیں جس نے انہیں سخت خلجان اور اُلجھن میں ڈال دیا ہے اور وہ اس میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

آیت ۴۶ ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْهَا﴾ ''جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اپنے ہی لیے کرتا ہے' اور جو کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔''

﴿وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور آپ کا رب کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے اپنے بندوں کے حق میں۔''

آیات ۴۷ تا ۵۴

اِلَیْهِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَیَوْمَ یُنَادِیْهِمْ اَیْنَ شُرَكَآءِیْ ۙ قَالُوْۤا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِیْدٍ ۚ﴿۴۷﴾ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ ﴿۴۸﴾ لَا یَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَیْرِ ۫ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَیَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَىِٕنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ هٰذَا لِیْ ۙ وَمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً ۙ وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰی رَبِّیْۤ اِنَّ لِیْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰی ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَلَنُذِیْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ ﴿۵۰﴾ وَاِذَاۤ اَنْعَمْنَا عَلَی الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِیْضٍ ﴿۵۱﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍ ﴿۵۲﴾ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ اَوَلَمْ یَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۵۳﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمْ فِیْ مِرْیَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ؕ اَلَاۤ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ﴿۵۴﴾

آیت ۴۷ ﴿اِلَیْهِ یُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ﴾ ''اُسی کی طرف لوٹتا ہے قیامت کا علم۔''

یعنی قیامت کا علم صرف اُسی کے پاس ہے۔

﴿وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ﴾ ''اور نہیں نکلتے کوئی پھل اپنے غلافوں سے اور نہ کسی مادہ کو حمل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اس کو جنتی ہے' مگر اُسی کے علم سے۔''

یعنی صرف قیامت ہی نہیں بلکہ تمام امورِ غیب کا علم اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ جزئیات کا بھی اتنا تفصیلی علم رکھتا ہے کہ اُس کی نگاہ سے کسی شخص کا کوئی چھوٹا سا عمل بھی مخفی نہیں رہ سکتا۔

واضح رہے کہ یہاں پر اُنْثٰی کا لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے انسانوں کے علاوہ تمام حیوانات کی مادائوں کا احاطہ بھی کرتا ہے۔

﴿وَیَوْمَ یُنَادِیْهِمْ اَیْنَ شُرَكَآءِیْ ۙ﴾ ''اور جس دن وہ ان کو پکارے گا کہ کہاں ہیں میرے وہ شریک؟''

﴿قَالُوْۤا اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِیْدٍ ﴿۴۷﴾﴾ ''وہ کہیں گے: ہم نے تو آپ سے عرض کر دیا ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کی گواہی دینے والا نہیں۔''

اُس وقت وہ بے بسی کے عالَم میں یہ بھی نہیں کہہ سکیں گے کہ دنیا میں ہم نے واقعتاً کچھ سہارے ڈھونڈ کر ان سے امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔

آیت ۴۸ ﴿وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور وہ سب گم ہو جائیں گے اُن سے جنہیں وہ پکارا کرتے تھے اس سے پہلے''

اس دن کی سختی کو دیکھ کر گویا اُن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔

﴿وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور وہ یقین کر لیں گے کہ اب ان کے لیے کوئی جائے فرار نہیں۔''

آیت ۴۹ ﴿لَا یَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَیْرِ ۫﴾ ''انسان بھلائی مانگنے سے نہیں تھکتا''

یہاں بھلائی (خیر) سے مراد دنیوی نعمتوں اور مال و دولت کی فراوانی ہے۔ کسی انسان کے پاس جتنی چاہے دولت ہو اور جس قدر چاہے نعمتیں اسے میسر ہوں' پھر بھی مزید حاصل

کرنے کی اس کی خواہش کبھی ختم نہیں ہوتی۔

﴿وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَئُوْسٌ قَنُوْطٌ ۝۴۹﴾ ''اور اگر کہیں اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو بالکل مایوس و دل شکستہ ہو جاتا ہے۔''

آیت ۵۰ ﴿وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ﴾ ''اور اگر اسے ہم اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیں اس کے بعد کہ اسے کوئی تکلیف پہنچی تھی''

﴿لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ﴾ ''تو وہ ضرور کہے گا کہ ہاں یہ تو میرا حق ہے''

سختی کا وقت گزر جانے کے بعد حالات بہتر ہو جانے پر وہ بڑے فخر سے دعوے کرے گا کہ میں نے اپنے ناخن تدبیر سے تمام عقدے حل کر لیے ہیں اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بالآخر میں نے اپنے تمام مسائل پر قابو پا لیا ہے۔

﴿وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ﴾ ''اور میں نہیں سمجھتا کہ یہ قیامت وغیرہ کوئی قائم ہونے والی شے ہے۔''

﴿وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ﴾ ''اور اگر مجھے لوٹا ہی دیا گیا میرے رب کی طرف''

یہ ہو بہو وہی الفاظ ہیں جو سورۃ الکہف کی آیت ۳۶ میں ایک مالدار اور آسودہ حال شخص کے حوالے سے نقل ہوئے ہیں۔ ان دونوں مکالموں میں صرف رُدِدْتُ اور رُجِعْتُ کا فرق ہے۔ یہ جملہ دراصل ایک ایسے مادیت پسند انسان کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے جو دنیا کی زندگی کو ہی اصل زندگی سمجھتا ہے اور ہمہ تن اسی کی زیب و زینت میں گم ہے۔ ایسے شخص کو اگر کسی وقت آخرت کی فکر پریشان کرتی ہے تو وہ اس خیال سے خود کو تسلی دے لیتا ہے کہ قیامت برپا ہونے کی یہ تمام باتیں اوّل تو محض ایک ڈھکوسلا ہیں، لیکن اگر بالفرض قیامت آ ہی گئی اور مجھے دوبارہ زندہ ہو کر اللہ کے حضور پیش ہونا ہی پڑا تو:

﴿اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ﴾ ''یقیناً میرے لیے اُس کے پاس بہتری ہی ہوگی۔''

اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مجھے دولت اور عزت دی ہے، اولاد عطا کی ہے اور طرح طرح کی دوسری نعمتوں سے بھی مجھے نواز رکھا ہے تو اس کا یہی مطلب تو ہے کہ میں اس کا منظورِ نظر ہوں اور وہ مجھ پر مہربان ہے۔ چنانچہ اس زندگی کے بعد بھی اگر کوئی زندگی ہے تو میں وہاں بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ کا منظورِ نظر ہی رہوں گا، وہ وہاں بھی مجھ پر اسی طرح مہربان

رہے گا اور جس طرح میں یہاں اس دنیا میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا ہوں وہاں بھی اسی طرح مزے اڑاؤں گا۔

﴿فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا﴾ ''تب ہم پوری طرح سے جتلا دیں گے ان کافروں کو جو کچھ بھی اعمال انہوں نے کیے ہوں گے۔''

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۵۰﴾ ''اور انہیں ہم لازماً مزا چکھائیں گے بہت ہی گاڑھے عذاب کا۔''

آیت ۵۱ ﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ﴾ ''اور جب ہم انسان پر نعمتوں کی بارش کر دیتے ہیں تو وہ رخ پھیر لیتا ہے اور اپنا پہلو بدل لیتا ہے۔''

﴿وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ۝۵۱﴾ ''اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بڑی لمبی لمبی دعائیں کرنے لگتا ہے۔''

آیت ۵۲ ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے: کیا تم نے غور کیا کہ اگر یہ (قرآن) واقعی اللہ ہی کی طرف سے ہو، پھر تم نے اس کا کفر کیا''

بے شک تم لوگ قرآن کو اللہ کا کلام ماننے کے لیے تیار نہیں ہو، لیکن تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ اگر یہ واقعی اللہ کا کلام ہو اور تم لوگ اس کے منکر ہو رہے ہو تو:

﴿مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝۵۲﴾ ''تو کون ہوگا اس سے بڑھ کر بھٹکا ہوا جو دور کی مخالفت میں پڑا ہو!''

یہ بالکل وہی اسلوب ہے جو اس سے پہلے سورۂ سبا کی اس آیت میں اختیار فرمایا گیا ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۛ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ﴾ (آیت ۴۶) ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہیے کہ میں تمہیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، یہ کہ تم کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے دو دو ہو کر یا اکیلے اکیلے، پھر غور کرو، نہیں ہے تمہارے ساتھی کو جنون کا کوئی عارضہ۔''

اب یہاں آخری مرتبہ پھر قرآن مجید کا ذکر آ رہا ہے اور یہ استدلال ہمارے اس موجودہ سائنسی دور کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔

آیت ۵۳ ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ ’’عنقریب ہم انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور ان کی اپنی جانوں کے اندر بھی‘‘

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی جانوں اور زمین و آسمان کے اندر اللہ تعالیٰ کی نشانیاں مبرہن انداز میں ان لوگوں کے سامنے آتی چلی جائیں گی۔

﴿حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾ ’’یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے۔‘‘

اس آیت میں دراصل معلومات کے اس explosion کی طرف اشارہ ہے جو سائنسی ترقی کے باعث آج کے دور میں ممکن ہوا ہے۔ موجودہ دور سائنس کا دور ہے۔ اس دور کی تاریخ زیادہ سے زیادہ دو سو برس پرانی ہے اور سائنسی ترقی میں یہ برق رفتاری جو آج ہم دیکھ رہے ہیں اسے شروع ہوئے تو ابھی نصف صدی ہی ہوئی ہے۔ چنانچہ پچھلی نصف صدی سے سائنسی ترقی کے سبب مسلسل حیرت انگیز انکشافات ہو رہے ہیں اور آئے روز نت نئی ایجادات سامنے آ رہی ہیں۔ ان سائنسی معلومات کے اکتشافات اور حقائق کے بے نقاب ہونے سے بتدریج قرآن کا حق ہونا ثابت ہوتا چلا جا رہا ہے۔

دورۂ ترجمہ قرآن کے آغاز میں ’’تعارفِ قرآن‘‘ کے تحت اعجازِ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ ان تمام پہلوؤں کا احصاء اور احاطہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت اعجازِ قرآن کے جس پہلو نے اہلِ عرب کو سب سے زیادہ متاثر بلکہ مسحور کیا تھا وہ اس کی فصاحت‘ بلاغت اور ادبیت تھی۔ اس وقت قرآن نے عرب بھر کے شعراء‘ خطباء اور فصحاء کو ان کے اپنے میدان میں چیلنج کیا کہ اگر تم لوگ دعویٰ کرتے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے تو تم اس جیسی ایک سورت بنا کر دکھاؤ۔ یہ چیلنج انہیں اس میدان میں دیا گیا تھا جس کے شہسوار ہونے پر انہیں خود اپنے اوپر ناز تھا اور جس کے نشیب و فراز کو وہ خوب اچھی طرح سے سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس چیلنج کا جواب نہ دے سکے۔

نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے ہاں چونکہ شاعری اور سخن وری و سخن فہمی کا بہت چرچا تھا اس لیے اس دور میں قرآن نے اپنے اسی ’’اعجاز‘‘ کو نمایاں کیا تھا۔ آج جبکہ سائنس کا دور ہے تو آج اعجازِ قرآن کے سائنسی پہلو کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ قرآن نے انسان کو کائنات میں بکھری ہوئی آیاتِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرنے اور ان پر غور کرنے کی بار بار دعوت دی

ہے‘ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس میدان میں چودہ سو سال پہلے کے مشاہدے اور آج کے مشاہدے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرانے زمانے کا انسان کائنات کے عجائبات کو ننگی آنکھ سے دیکھتا تھا جبکہ آج کے انسان کو بہت بڑی بڑی ٹیلی سکوپس‘ الیکٹرانک مائیکروسکوپس اور نہ جانے کون کون سی سہولیات میسر ہیں۔ بہرحال آج خصوصی محنت اور کوشش سے یہ حقیقت دنیا کے سامنے لانے کی ضرورت ہے کہ جن حقائق تک سائنس آج پہنچ پا رہی ہے قرآن نے بنی نوع انسان کو چودہ صدیاں پہلے ان سے متعارف کرا دیا تھا۔ لیکن مقامِ افسوس ہے کہ ابھی تک کسی مسلمان اسکالر کو قرآن اور سائنسی معلومات کا تقابلی مطالعہ (comparative study) کر کے یہ ثابت کرنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ اب تک کے تمام سائنسی انکشافات قرآن کی فراہم کردہ معلومات کے عین مطابق ہیں۔ حال ہی میں فرانسیسی سرجن ڈاکٹر موریس بوکائی [Maurice Bucaile (1920-1998)] نے ’’بائبل‘ قرآن اور سائنس‘‘ (The Bible, The Quran and Science) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے‘ جس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ اب تک جو بھی سائنسی حقائق دنیا کے سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف قرآن میں دی گئی تفصیلات کے عین مطابق ہیں بلکہ ان سب کے مطالعہ سے قرآن کی حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے۔ اپنی اسی تحقیق کی بدولت موصوف سرجن کو ایمان کی دولت بھی نصیب ہوئی۔

قرآن کی بعض آیات تو اگرچہ آج بھی سائنسی حوالے سے تحقیق طلب ہیں‘ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اب تک سامنے آنے والے سائنسی انکشافات کی روشنی میں قرآن کی متعلقہ آیات و عبارات کے مفاہیم و مطالب مزید نکھر کر سامنے آئے ہیں۔ بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ قرآن کے بعض الفاظ کے جو معانی پرانے زمانے میں سمجھے گئے تھے وہ غلط ثابت ہوئے ہیں اور ان کی جگہ ان الفاظ کے زیادہ واضح اور زیادہ منطقی معانی سامنے آئے ہیں۔ مثلاً لفظ عَلَقَہ کا وہ مفہوم جو قبل ازیں سورۃ المؤمنون کی آیت ۱۴ کے ضمن میں بیان ہوا ہے زیادہ بہتر اور درست ہے۔ اور لفظ ’’فائدہ‘‘ اور ’’فواد‘‘ کی وہ وضاحت جو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۶ کے تحت دی گئی ہے زیادہ واضح اور منطقی ہے۔

اسی طرح اجرامِ سماویہ کے بارے میں قرآنی الفاظ ﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ (یٰسٓ) کا وہ مفہوم جو آج کے انسان کو معلوم ہوا ہے وہ پرانے زمانے کے انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا‘ بلکہ انسانی تاریخ شاہد ہے کہ اجرامِ فلکی اور ان کی گردش سے متعلق مختلف

زمانوں میں مختلف موقف اختیار کیے گئے۔ کسی زمانے میں انسان سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج حرکت میں ہے۔ پھر اسے یوں لگا جیسے سورج ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ حتیٰ کہ آج کے انسان نے اپنی تحقیق و جستجو سے یہ ثابت کر دیا کہ سچ یہی ہے: ﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝﴾ کہ یہ سب ہی اپنے اپنے مدار میں گھوم رہے ہیں۔ بلکہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ متحرک ہے‘ حتیٰ کہ ہر ایٹم (atom) کے اندر اس کے اجزاء (الیکٹرانز‘ پروٹانز اور نیوٹرانز) بھی بے تابانہ مسلسل گردش میں ہیں۔ اقبالؔ نے اپنے اس شعر میں اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے:؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات اِک تغیّر کو ہے زمانے میں!

موجودہ دور میں اگرچہ مسلمانوں کو قرآن اور سائنس کے حوالے سے خصوصی اہتمام کے ساتھ تحقیق و تدقیق کرنے کی ضرورت ہے‘ لیکن ایسی کسی تحقیق کے دوران خواہ مخواہ تکلف کرنے اور زبردستی کھینچ تان کر کے قرآن کے دوراز کار مفاہیم نکالنے کی کوشش میں نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ جہاں پر عقلی اور سائنسی طور پر بات سمجھ میں نہ آئے وہاں تسلیم کر لینا چاہیے کہ ابھی بات واضح نہیں ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے: ﴿كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ﴾ (آل عمران:۷)۔ ایک وقت ضرور آئے گا کہ جو بات آج واضح نہیں ہے وہ واضح ہو جائے گی‘ اور خارج کی دنیا میں اس حوالے سے جو حقائق بھی منکشف ہوں گے وہ قرآن کے الفاظ کے عین مطابق ہوں گے۔ ان شاء اللہ! البتہ جن سائنسی حقائق کی اب تک قرآن کے ساتھ مطابقت ثابت ہو چکی ہے انہیں عام کر کے قرآن کی حقانیت کے سائنٹفک ثبوت کے طور پر لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

آیت زیر مطالعہ میں فعل مضارع (سَنُرِيْهِمْ) سے پہلے ’’س‘‘ کی وجہ سے اس لفظ کے مفہوم میں خصوصی طور پر مستقبل کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی مستقبل میں ہم انہیں اپنی ایسی نشانیاں دکھائیں گے جن سے قرآن کی حقانیت واضح ہو جائے گی۔ اس ’’مستقبل‘‘ کا احاطہ کرنے کی کوشش میں اگر چشم تصور کو جنبش دی جائے تو اس کی حدود نزولِ قرآن کے دَور کی فضاؤں سے لے کر زمانہ قیامت کی دہلیز تک وسعت پذیر نظر آئیں گی۔ آج وقت کی شاہراہ پر انسانی علم کی برق رفتاری کا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ انسانی

تحقیق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ خلاء کی پہنائیوں کے راز اس کے سامنے ایک ایک کر کے بے نقاب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ سمندروں کی اتھاہ گہرائیاں اس کی عمیق نظری کے سامنے سرنگوں ہیں۔ قطب شمالی (Arctic) اور قطب جنوبی (Antarctic) سمیت زمین کا چپہ چپہ ہر پہلو سے نت نئی تحقیق کی زد میں آ چکا ہے۔ غرض سائنسی ترقی کا یہ ’’جن‘‘ کہکشاؤں کی بلندیوں سے لے کر تحت الثریٰ کی گہرائیوں تک معلومات کے خزانے اکٹھے کر کے بنی نوعِ انسان کے قدموں میں ڈالتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن الحمدللہ! اس تحقیق کے ذریعے سے اب تک جو حقائق بھی سامنے آئے ہیں وہ سب کے سب قرآن کی حقانیت پر گواہ بنتے چلے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے علم و تحقیق کا یہ قافلہ وقت کی شاہراہ پر اپنا سفر قیامت تک جاری رکھے گا۔ ہمارا ایمان ہے کہ اس سفر کے دوران ایجاد و دریافت کے میدان میں انسان کو جو کامیابیاں بھی نصیب ہوں گی اور انفس و آفاق کی دنیاؤں کے جو جو راز بھی منکشف ہوں گے وہ سب کے سب بالآخر قرآن حکیم کی حقانیت پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے چلے جائیں گے۔

﴿اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۝۵۳﴾ ’’کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ آپ کا ربّ ہر چیز پر گواہ ہے!‘‘

کائنات کی ہر چیز اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ لیکن اس نے قرآن میں صرف اسی حد تک حقائق کا ذکر کیا ہے جس حد تک انسان انہیں سمجھ سکتا ہے اور اسی انداز میں ان کا ذکر کیا ہے جس انداز میں انسانی فہم و شعور کی رسائی ان تک ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے وہ حقائق جن تک آج کے انسان کی تدریجاً رسائی ہوئی ہے اگر وہ آج سے پندرہ سو سال پہلے من و عن بیان کر دیے جاتے تو اس وقت انہیں کون سمجھ سکتا تھا۔

آیت ۵۴ ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ ۭ﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! یہ لوگ اپنے رب کے ساتھ ملاقات سے متعلق شک میں پڑے ہوئے ہیں۔‘‘

﴿اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ۝۵۴﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ! بے شک وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔‘‘

❁❁❁

دین کا تیسرا اہم تقاضا

فریضۂ اقامتِ دین

سورۃ الشّوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ کی روشنی میں

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بعد:
اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعوتِ بندگیٔ ربّ اور فریضۂ شہادت علی الناس کے بعد جو تیسری بڑی ذمہ داری اِس اُمت کے سپرد کی گئی ہے اس کے لیے قرآنی اصطلاح ''اقامتِ دین'' ہے' یعنی دین کا قیام' دین کا غلبہ اور دین کو بحیثیتِ نظامِ زندگی بالفعل قائم کر دینا۔ اصلاً تو یہ نتیجہ ہے اسی ''عبادتِ ربّ'' کا' جس سے گفتگو شروع ہوئی تھی' یعنی عبادت کا نتیجہ ''شہادتِ حق'' یا ''شہادت علی الناس'' اور شہادتِ حق کی بلند ترین منزل ''اقامتِ دین'' ہے' لیکن ان تینوں اصطلاحات کو علیحدہ علیحدہ ذہنوں میں محفوظ کرنا اس لیے ضروری ہو گیا ہے کہ فہمِ دین سے رفتہ رفتہ بُعد پیدا ہو جانے کی وجہ سے مجرد لفظ ''عبادت'' سے ذہن ان دوسری دو ذمہ داریوں تک نہیں پہنچتا جو حقیقت میں لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا جب تک اس کے مضمرات کو کھول کر بیان نہ کر دیا جائے کہ اس بیج میں یہ پورا درخت پنہاں ہے' اس وقت تک ذہن اسی محدود تصورِ عبادت کی گرفت میں رہتا ہے کہ عبادتِ ربّ کا مقصد محض نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ہے۔ اس محدود تصور سے رستگاری کے لیے ضروری ہے کہ ان تینوں اصطلاحات کو ملحوظ رکھا جائے جو درحقیقت ایک ہی نکتۂ ایمان کی تفسیریں ہیں! لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ ''مطالباتِ دین'' کے ضمن میں ان تین اصطلاحات کو ذہن نشین کر لیں کہ یہ تینوں چیزیں فرائضِ دینی میں شامل ہیں اور فلاحِ

دُنیوی اور نجاتِ اُخروی کے لیے ناگزیر ہیں۔

اقامتِ دین کی گفتگو اصلاً تو ہمارے منتخب نصاب میں سورۃ الصّف کے درس کے ضمن میں آتی ہے' جس کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا تکمیلی مقصد یہ ہے کہ جو ہدایت ورہنمائی اور دینِ حق یعنی ضابطۂ حیات دے کر آپؐ بھیجے گئے تھے اسے آپؐ پوری زندگی کے نظامِ اطاعت پر غالب کر دیں۔ چنانچہ وہاں فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ﴾ (الصف:۹) ''وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول (ﷺ) کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا ہے (یعنی کتاب اور نظامِ شریعت دونوں دے کر) تاکہ آپؐ اس (ہدایت اور دینِ حق) کو ہر جنسِ دین پر غالب کر دیں!''

قابلِ غور بات

اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ کیا قرآن کا نزول محض تلاوت کے لیے ہوا ہے؟ یا یہ صرف زبانی تعریف وتوصیف (lip service) کے لیے آیا ہے؟ یا محض ایصالِ ثواب کے لیے اُتارا گیا ہے؟ نہیں' بلکہ قرآن تو نبی اکرم ﷺ پر اس لیے نازل کیا گیا تھا تاکہ اس کے مطابق نظامِ زندگی بالفعل قائم ہو اور دُنیا کے سامنے اللہ کے دین کا جامع اور کامل نمونہ آ جائے۔ ازروئے قرآن حکیم نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد یہی تھا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ اسی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اور اسی کے لیے محنتیں کرنے' مشقتیں جھیلنے' جانیں کھپانے' قربانیاں دینے' مال خرچ کرنے' غرضیکہ اس راہ میں اپنے جسم وجان کی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں لگانے کا مطالبہ ان لوگوں سے بھی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں۔ لہٰذا سورۃ الصّف میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ کا مقصدِ بعثت بیان کرنے کے بعد فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا هَلۡ اَدُلُّکُمۡ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنۡجِیۡکُمۡ مِّنۡ عَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۱۰﴾
تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُجَاهِدُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ بِاَمۡوَالِکُمۡ وَاَنۡفُسِکُمۡ ؕ
ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ (الصّف)

''اے ایمان والو! کیا میں تم کو اس تجارت کے بارے میں بتاؤں جو تم کو عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ (وہ یہ کہ) اللہ اور اس کے رسولؐ پر پختہ یقین رکھو اور (اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے) اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد

(اور مجاہدہ کی روش اختیار) کرو (اس کے لیے اپنی صلاحیتیں، توانائیاں، جانیں، مال و منال اور اپنے اوقات اللہ کی راہ میں کھپاؤ)۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو!''

آج کی نشست میں اسی مضمون کی وضاحت کے لیے ہم سورۃ الشوریٰ کی آیات ۱۳ تا ۱۵ کا مطالعہ کریں گے۔ فرمایا:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى .....﴾

''(اے مسلمانو!) اُس (اللہ) نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے از جنسِ دین وہی جس کی وصیت کی تھی اس نے نوحؑ کو، اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبیؐ) تمہاری طرف اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو.....''

نوٹ کیجیے کہ ''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ'' میں جمع مخاطب کی ضمیر استعمال ہوئی ہے، جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ اس آیت کی مخاطب ہر دَور اور ہر زمانے کی اُمتِ مسلمہ ہے، البتہ ''وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ'' میں واحد مخاطب کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے۔

تمام انبیاء و رُسل کا دین ایک ہے

اس آیۂ مبارکہ کے زیرِ مطالعہ جزو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کے لیے بطورِ دین وہی چیز مقرر کی ہے جو اس سے پہلے دیگر جلیل القدر انبیاء و رُسل کے لیے مقرر کی تھی۔ آیت کے اس جزو سے ایک ضمنی مضمون یہ نکلتا ہے کہ یہاں جن پانچ انبیاء و رُسل (حضراتِ نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور محمد رسول اللہ ﷺ) کا تذکرہ ہے، ان کا انبیاء و رُسل کے مابین ایک خصوصی مقام و مرتبہ ہے۔ قرآن مجید کی ایک اصطلاح ہے ''اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ'' (رسولوں میں ایک خاص مرتبہ والے، مقامِ عزیمت پر فائز رسول) اکثر و بیشتر علماء کا یہی خیال ہے کہ ''اُولوا العزم من الرسل'' یہی پانچ رسول ہیں۔ بعض علماء اس فہرست میں حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام کو بھی شامل کرتے ہیں، لیکن علماءِ سلف کی اکثریت کا رجحان انہی پانچ رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے۔ گروہِ انبیاء و رُسل میں یہ پانچ امتیازی شان کے حامل ہیں۔ ایک بات اس سے یہ بھی معلوم ہوئی کہ ان تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام کا دین ایک ہی رہا ہے۔ جو دین حضرت محمد ﷺ کا ہے وہی دین حضرت

نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سلام اللہ علیہم کا تھا۔

لفظ ''دین'' کا مفہوم

آگے بڑھنے سے پہلے لفظ ''دین'' کے معانی و مفاہیم کو اچھی طرح جان لینا اور سمجھ لینا ضروری ہے۔ یہ لفظ بھی ''عبادت'' اور ''شہادت'' کے الفاظ کی طرح تعلیماتِ اسلامی میں بڑا اہم اور مرکزی لفظ ہے اور اس کے صحیح اور حقیقی فہم پر ہی قرآن حکیم کی دعوت کا صحیح اور درست مطلب سمجھنا منحصر ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ ''دین'' کا اصل مفہوم جزا و سزا یا بدلہ ہے۔ چنانچہ سورۃ الفاتحہ میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ ''(جزا و سزا، بدلے کے دن کا مالک!) اردو کا مشہور محاورہ ہے ''جیسا کرو گے، ویسا بھرو گے!'' عربی میں اسی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے محاورہ بولا جاتا ہے ''كَمَا تَدِيْنُ تُدَانُ''۔ اسی جزا و سزا کے بنیادی تصور سے عربی زبان میں لفظ ''دین'' کے مفاہیم میں انتہائی وسعت پیدا ہوتی ہے اور غور کرنے سے یہ تمام مفاہیم اور وسعتیں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جزا و سزا کسی ضابطے اور قانون کے تحت ہی ہوتی ہے۔ یعنی ضابطے اور قانون کی پابندی اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے پر انسان جزا کا مستحق ٹھہرتا ہے اور اس کی خلاف ورزی اور نافرمانی سے سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ لہٰذا اسی لفظ ''دین'' میں جزا و سزا اور بدلے کے ساتھ ساتھ قانون اور ضابطے کا تصور بھی پیدا ہوتا ہے۔ اب قانون اور ضابطے کے تصور کے مقتضیات و لوازم میں کسی مقنّن اور کسی مطاع کا تصور بھی شامل ہے۔ یعنی ایسی ہستی کا تصور جو قانون عطا کرنے والی (Law Giver) ہو۔ اب مزید آگے بڑھیے۔ جزا و سزا، قانون و ضابطہ اور مقنن و مطاع کے تصورات و مقتضیات میں اطاعت کا تصور ایک ناگزیر لازمہ کی حیثیت سے شامل ہے۔ قرآن مجید کی مخصوص اصطلاح ''دین'' ان تمام تصورات کے اجتماع سے بنی ہے اور از روئے قرآن اس کا مفہوم و مطلب یہ ہے کہ:

> ''ایک پورا نظامِ زندگی اور مکمل ضابطۂ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع، مقنن (Law Giver) اور حاکمِ مطلق (Sovereign) مان کر اس کی جزا کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ قانون اور ضابطے کے مطابق اس ہستی (یا ادارے) کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے!''

دین کے اس تصور کو اس کی تمام تر کُلیت کے ساتھ سامنے رکھئے۔ قرآن مجید سے ہمیں لفظ ''دین'' کا یہی جامع تصور ملتا ہے۔ اس کے لیے اب میں قرآن مجید ہی سے استشہاد کرتا ہوں۔

دین الملک: سورۂ یوسف میں ''دِیْنِ الْمَلِكِ'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن ہی سے ثابت ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں مصر میں بادشاہت کا نظام قائم تھا اور حضرت یوسفؑ اس نظام میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ قحط کے دَور میں جب ان کے بھائی دوبارہ غلہ لینے مصر پہنچے اور آپؑ نے اپنے چھوٹے بھائی بن یامین کو اپنے پاس روکنا چاہا تو اس وقت مصر میں نظامِ بادشاہت کا جو قانون رائج تھا اس کے تحت ان کے لیے اپنے بھائی کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک خصوصی تدبیر فرمائی۔ سورۂ یوسف میں ارشاد ہے:

﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ (آیت:۷۶)

''اس طرح ہم نے اپنی تدبیر سے یوسفؑ کی تائید کی (یعنی اس کے لیے اپنے بھائی کو روکنے کا ایک سبب بنا دیا) اُس (یوسفؑ) کا کام یہ نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا' اِلا یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے!''

چنانچہ دیکھ لیجیے کہ بادشاہت کے پورے نظام کو جو بادشاہ کی حاکمیت کی بنیاد پر مصر میں رائج تھا ''دین الملک'' سے تعبیر کیا گیا۔

دین اللہ: اس وضاحت کو سامنے رکھ کر اب آخری پارے کی مختصر سی سورت ''سورۃ النصر'' کو اپنے سامنے لائیے:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾

''جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہوگئی' اور (اے نبی ﷺ!) آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔''

اس مقام پر جو ''دین اللہ'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اس کو سمجھنا ضروری ہے کہ یہ دین اللہ کیا ہے؟ دین اللہ یہ ہے کہ صرف اللہ کو مطاع و حاکمِ مطلق اور مقننِ حقیقی تسلیم کر کے اُسی کی جزا کی اُمید رکھتے ہوئے اور اسی کی سزا سے خوف کھاتے ہوئے' صرف اسی کے قانون' اسی

کے ضابطے اور اسی کی عطا کردہ شریعت کے مطابق اپنے انفرادی و اجتماعی معاملات کو سرانجام دیا جائے۔ بالفاظِ دیگر اپنی پوری زندگی میں صرف اور صرف اسی کی کامل اطاعت کو لازم کر لیا جائے۔ اسی رویے اور طرزِ عمل کا نام ہے اللہ کے دین کے تحت زندگی گزارنا' اور قرآن مجید میں اسی کا حکم بایں الفاظ دیا گیا ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪﴾ (البقرۃ:۲۰۸) ''اے اہلِ ایمان! (اللہ کی) اطاعت میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ!''

ہر دین غلبہ چاہتا ہے: از روئے قرآن ''دین'' کا جو تصور ہمارے سامنے آتا ہے اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار سے اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دین درحقیقت دین ہے ہی نہیں جو غالب نہ ہو۔ چنانچہ انگریز کے دَور میں جس دین کی اصل حکمرانی تھی وہ دین ''انگریز'' تھا۔ وائسرائے ہند کو تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت حاصل تھی اور مطاعِ مطلق برطانوی پارلیمان تھی۔ مسلمانوں کو نماز روزے کی اجازت تھی' لیکن دینِ اسلام غالب نہ تھا۔ اس مفہوم کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا ہے:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

جدید ذہن ''دین'' کو ''مذہب'' کا مترادف سمجھتا ہے اور اسے ایک نجی (پرائیویٹ) معاملہ قرار دیتا ہے۔ بدقسمتی سے پوری دنیا میں اکثر و بیشتر مذہب کا یہی تصور راسخ ہو گیا ہے۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔ اسلام مذہب نہیں' بلکہ دین ہے۔ خود قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ﴾ (آل عمران:۱۹) ''یقیناً اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے''۔ مذہب کے لفظ سے جو تصور اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ چند مابعد الطبیعیات عقائد (dogmas) کو مان لیا جائے اور ان عقائد کے تحت چند مراسم عبودیت (rituals) کی انجام دہی اور چند معاشرتی رسوم (social customs) کی پابندی کر لی جائے تو مذہب کا تقاضا پورا ہو گیا۔ مذہب کا تعلق واقعتاً انسان کی شخصی' ذاتی اور نجی زندگی ہی سے ہے۔ اس معنی میں اسلام مذہب ہے ہی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام کی تعبیر کے لیے لفظ ''مذہب'' نہ کہیں قرآن مجید میں وارد ہوا ہے اور نہ ہی پورے کے پورے ذخیرۂ احادیث میں کہیں استعمال ہوا ہے۔ بلکہ ہر جگہ اصل اصطلاح ''دین'' ہی استعمال ہوئی ہے' جس کا وسیع تر مفہوم و

مطلب میں بڑے شرح وبسط کے ساتھ بیان کر چکا ہوں۔ ہماری بول چال کے حوالے سے آپ اسے اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھنا چاہیں تو اس کے لیے ہماری زبان کی جدید اصطلاح ''نظامِ حیات'' ہے' جو ادائیگی ومفہوم کے اعتبار سے لفظ ''دین'' کے قریب ترین ہے۔

دینِ جمہور: ''دین الملک'' اور ''دین اللہ'' جیسی قرآنی اصطلاحات کے بعد اب ''دینِ جمہور'' کی اصطلاح پر غور کیجیے۔ موجودہ دَور میں جب مذہب کو انسانی زندگی کا محض ایک نجی معاملہ بنا دیا گیا تو دین کے جامع تصور یعنی اس کے نظامِ حیات ہونے کے تصور کی جگہ خالی ہوگئی۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے آپ سے آپ دنیا میں اس تصور اور نظریے نے رواج پا کر قبولِ عام حاصل کر لیا کہ زندگی کے اجتماعی معاملات' اصول وضوابط اور معاشرتی نظام ''جمہور'' خود اپنی رائے' اپنی مرضی' اپنی پسند وناپسند اور اپنے تجربات ومشاہدات کے اعتبار سے طے کریں گے۔ جمہور یا ان کے نمائندے یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہوں گے کہ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز' کیا صحیح ہے اور کیا غلط! ان کے لیے کسی آسمانی شریعت یا ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ پارلیمان کی اکاون فیصد اکثریت کو ہر بات کے فیصلے کا اختیارِ مطلق حاصل ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ دو مَردوں کی شادی کے جواز کا قانون پاس کر دے' جیسا کہ فی الواقع برطانوی پارلیمان نے کیا۔ وہ چاہے تو سڑکوں پر' پارکوں' کلبوں اور بازاروں میں' فلموں اور ڈراموں میں اور اسٹیج پر عریانی' مادرزاد برہنگی' حتیٰ کہ جنسی فعل تک کو جائز قرار دے دے' جیسا کہ بعض یورپی ممالک اور امریکی ریاستوں میں اس فحاشی پر کوئی قدغن نہیں ہے' بلکہ اس شیطانی عمل کو قانون کا تحفظ حاصل ہے۔ اسی طرح پارلیمان چاہے تو قمار بازی' سٹہ' لاٹری اور اسی قبیل کے منکرات کو تفریح کا مقام دے کر انہیں قانونی طور پر جائز قرار دے دے' جیسا کہ فی الواقع دنیا کے اکثر ممالک نے کر رکھا ہے۔ شراب نوشی' جنسی بے راہ روی' زنا' عملِ قومِ لوط' عریانی' قمار بازی' غرضیکہ کوئی شیطانی عمل ایسا نہیں کہ جس کو سندِ جواز دینے کے لیے جمہور کے نمائندوں کی اکاون فیصد اکثریت مجاز نہ ہو۔ قانون سازی اور حدود وتعزیرات کی تعیین کسی اخلاقی قدر اور آسمانی ہدایت کی پابند نہیں' بلکہ اس کے لیے معیار جمہور کی پسند اور ناپسند ہے۔ انہیں اس میں ردّ وبدل اور ترمیم وتنسیخ کا بھی پورا حق حاصل ہے۔ اس طرزِ فکر اور نظریے کے لیے ایک اصطلاح ''سیکولرازم'' یعنی لادینی نظامِ حیات وضع ہوئی اور آج اسی فکر کا ساری دنیا میں غلبہ

ہے۔ یہاں تک کہ ہم پاکستانی بھی' جنہوں نے نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے تحریکِ پاکستان چلائی تھی اور پاکستان قائم کیا تھا' اپنی روح کے اعتبار سے اسی نظامِ حیات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ عملی طور پر چاہے ہم ابھی اس طرزِ فکر کی پوری نقالی نہ کر رہے ہوں' لیکن فکری طور پر اسی نظریے کا ہم پر کامل غلبہ واستیلاء ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ربّ العزت کی ہدایت اور شریعت سے آزادیہ ''جمہوریت'' نہ صرف ایک لعنت ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ سے بغاوت ہے' سراسر معصیت ہے' طغیان اور سرکشی ہے اور فکر سے لے کر عمل تک بالکلیہ کفر وشرک ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ جو دین اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نازل کیا تھا اور جو خاتم النبیین والمرسلین حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پذیر ہوا' اس کے نزول کا مقصد اس دین اللہ کا بالفعل قیام ہے۔ یعنی اللہ کا دین بالفعل قائم ہو اور تمام معاملات اس کے مطابق طے ہوں' تمام امور کا تصفیہ اسی کی روشنی میں کیا جائے۔ کسی شے کو حلال یا حرام اور جائز یا ناجائز قرار دینے کا مختار ومجاز صرف اور صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو تسلیم کیا جائے اور اس سے سرِمُو انحراف نہ کیا جائے۔

دین اور شریعت کا فرق

اس موقع پر ایک اشکال آپ سے آپ ذہن میں آتا ہے کہ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت اور تھی اور حضرت محمد ﷺ کی شریعت اور ہے۔ ان دونوں شریعتوں کا فرق تو ہمیں معلوم ہے' اس لیے کہ تورات مخرف صورت میں ہی سہی' موجود ہے اور قرآن مجید اور سنتِ رسولؐ بھی بتمام وکمال محفوظ ہے۔ البتہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفے اور ان کی شریعتیں موجود نہیں ہیں۔ لہٰذا شریعت محمدیؐ اور شریعت موسویؑ کے مابین فرق آج بھی تیقّن کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً نمازوں کی تعداد اور اوقات میں اور روزہ کے احکام میں فرق بہت واضح ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو چیز مشترک ہے وہ کوئی اور چیز ہے اور جس میں باہمی فرق ہے وہ مختلف چیز ہے۔ ان دونوں کے لیے دو مختلف اصطلاحات ہیں۔ چنانچہ ایک کا نام ''دین'' اور دوسری کا نام ''شریعت'' ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک تمام انبیاء ورُسل کا دین ایک ہی رہا ہے۔ اس میں کسی دَور میں بھی قطعاً کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ دین یہ ہے کہ عقیدۂ توحید کے مقتضیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا جائے'

اس کے بھیجے ہوئے انبیاء ورُسل ﷺ اوراس کی اتاری ہوئی کتابوں کی تصدیق کی جائے‘ ملائکہ‘ بعث بعدالموت‘ حشر ونشر‘ حساب وکتاب‘ جزاوسزااور جنت ودوزخ پر پختہ یقین رکھا جائے اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاکمِ مطلق اور مقننِ حقیقی تسلیم کیا جائے۔ جب کہ شریعت عملی زندگی کے احکام پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ حالات کے بدلنے‘ انسانی ذہن کے ارتقاء اور تہذیب وتمدن اور وسائل و ذرائع کی ترقی کے ساتھ ساتھ احکامِ شریعت میں تغیر وتبدّل ہوتا رہا‘ تا آنکہ شریعت محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ لیکن جہاں تک دین کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے اور وہ ’’اسلام‘‘ ہے از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟﴾ (آل عمران:۱۹)

’’یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے!‘‘

دین اور شریعت کے فرق کو آپ دورِ جدید کی دو اصطلاحوں کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں۔ کسی بھی ملک کا ایک تو ’’اساسی دستور‘‘ ہوتا ہے‘ جس میں یہ متعین ہوتا ہے کہ حاکم کون ہے‘ حاکمیت (sovereignty) کس کی ہے اور وہ حاکمیت کس طرح استعمال (channelize) ہوگی۔ حاکمیت کے تحت قانون بنانے کا طریقہ (process) کیا ہوگا‘ وہ حاکمیت کیسے روبہ عمل (exercise) ہوگی‘ قوانین میں ردّوبدل کیسے ہوگا‘ ملکی انتظام کیسے چلے گا‘ عدلیہ اور انتظامیہ کے مختلف شعبوں کا باہمی ربط کیا ہوگا‘ اور ایک دوسرے کے لیے احتساب ومحاسبہ اور ان میں باہمی توازن (checks and balances) کا نظام کیا ہوگا؟ اساسی دستوران تمام مسائل پر محیط ہوتا ہے۔ کسی بھی ملک کا دستور بناتے ہوئے اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ اس کی اساسی دفعات بہت پائیدار اور مستحکم ہوں۔ چونکہ ان میں بار بار کی تبدیلی مناسب نہیں ہوتی‘ اس لیے اس میں تبدیلی کے طریقِ کار کو بڑا ہی مشکل رکھا جاتا ہے۔ لیکن اس اساسی دستور کے تحت جو قوانین بنتے رہتے ہیں ان کا معاملہ دوسرا ہے۔ تعزیرات علیحدہ لکھی جاتی اور طے کی جاتی ہیں‘ دیوانی اور فوجداری قوانین علیحدہ مدوّن کیے جاتے ہیں اور ان میں ملکی دستور کے تحت حسبِ ضرورت آسانی سے ردّوبدل کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو آرڈی نینسز کے ذریعے سے بھی قوانین میں ردّوبدل ہو جاتا ہے‘ لیکن جمہوری ممالک میں تو بہرحال یہ اختیار پارلیمنٹ کے پاس ہوتا ہے کہ وہ ۴۹ اور ۵۱ کے فرق سے قانون بنا بھی سکتی ہے اور اس میں ردّوبدل بھی

کرسکتی ہے۔ تو اس کو یوں سمجھئے کہ ہمارے دین کے نظام میں دستور کی جگہ تو ’’دین‘‘ کی اصطلاح ہے اور قانون کی جگہ ’’شریعت‘‘ کی اصطلاح ہے۔ دین اصل میں اس سے بحث کرتا ہے کہ مطاع کون ہے‘ حاکم کون ہے‘ حاکمیت کس کی ہے‘ قانون کس کا چلے گا‘ مرضی کس کی چلے گی اور وہ حاکمیت کس طرح روبہ عمل آئے گی؟ یعنی یہ کس کے واسطے سے ہوگی‘ حاکمِ مطلق کے نمائندے کی حیثیت کیسے حاصل ہوگی؟ یہ تمام امور ہمیشہ سے طے شدہ ہیں اور ان میں کبھی کوئی فرق نہیں رہا کہ مطاعِ مطلق اور حاکمِ مطلق صرف اللہ ہے جو ’’اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ‘‘ کی شان کا حامل ہے۔ اس کی طرف سے ملنے والا ہر قانون واجب العمل ہے اور اسے لے کر آنے والے نمائندے اس کے رسول ہیں۔ اس کے قانون کی جو تعبیر (interpretation) اس کا نمائندہ (یعنی رسولؐ) کرے تو اسے قبول کرنا اور اس کی روشنی میں اپنے معاملات طے کرنا لازمی ہے۔ جن معاملات میں قرآن وحدیث کی کوئی نصِ قطعی موجود نہ ہو انہیں دین کی روح کے تحت باہمی مشاورت سے طے کیا جاسکتا ہے‘ لیکن جو حدود وقیود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے عائد کر دی گئی ہیں ان سے سرِمُو ہٹنے یا اس میں ردّوبدل کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ہے آیت کے اس حصے کی شرح کہ:

﴿شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّ الَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَ مَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَ عِیۡسٰۤی .....﴾

اقامتِ دین کا حکم

آیت کے اگلے ٹکڑے میں اب وہ اصطلاح وارد ہورہی ہے جو ہماری آج کی گفتگو کا عنوان ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ یہ سب کچھ تمہیں کس لیے دیا گیا ہے؟ کیا اس لیے کہ تم اللہ کی عطا کردہ کتابِ دستور کو محض حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بنالو؟ اس کا احترام بس اس طرح سے کرلو کہ اسے ریشمی جزدان میں لپیٹ کر رکھ لو اور ہاتھ سے گر جائے تو اس کے برابر اناج تول کر دے دو؟ کہیں کوئی تقریب ہو‘ چاہے وہ کسی سینما‘ کلب‘ بار‘ ناچ گھر یا ریس کورس کی افتتاحی تقریب ہو‘ تو اس کی تلاوت کرلو؟ معاذ اللہ‘ ایسا ہرگز نہیں! بلکہ یہ دین تو محض اس لیے دیا گیا ہے کہ:

﴿اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ﴾

''یہ کہ اس دین کو قائم کرو اور اس باب میں تفرقہ کا شکار نہ ہو جاؤ!''

یہ دین اپنا نفاذ اور غلبہ چاہتا ہے۔ وہ دستور اور قانون بے معنی ہے جو کہیں نافذ نہیں۔ ہمارے ملک کے ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۶ء کے جو دستور رکھے ہوئے ہیں کیا وہ واقعی دستور کہلائے جا سکتے ہیں جب کہ وہ نافذ ہی نہیں؟ یہ تو بس ہماری تاریخ کی یادگار بن کر رہ گئے ہیں۔ کوئی دستور صحیح معنوں میں اسی وقت دستور کہلا سکتا ہے جب کہ وہ نافذ بھی ہو۔ قانون اسی کو کہا جائے گا جس کے مطابق عدالتوں میں فیصلے ہو رہے ہوں۔

طرفہ تماشا

یہ عجب طرفہ تماشا ہے کہ دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں مسلمانوں کے نام سے جو قوم بس رہی ہے وہ دعویٰ تو اس بات کا کرتی ہے کہ اصل دستور اور قانون اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت ہے' لیکن یہ عجیب شتر گربگی ہے کہ ان کا عمل اس دعویٰ کے بالکل برعکس ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا عطا کردہ دستور و قانون ان کی عملی و اجتماعی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتا۔ ان کے ہاں قرآن و سنت کے اوامر و نواہی کی سرے سے کوئی وقعت ہی نہیں' لہٰذا کوئی فیصلہ اس کے مطابق نہیں ہو پاتا۔ قرآن کا استعمال بس حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کے لیے رہ گیا ہے' جبکہ وہ قرآن حکیم کے ضابطۂ حیات اور پوری زندگی کے لیے کامل ہدایت و رہنمائی ہونے کے دعوے دار بھی ہیں۔ مسلمان قوم کے اس طرزِ عمل کو ایک عجوبہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ سورۃ الرعد میں منکرینِ قیامت کا ایک اعتراض نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ﴾

(آیت ۵)

''اور اگر تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل تو ان کی یہ بات ہے کہ آیا جب ہم مٹی (میں مل کر مٹی) ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ پیدا کیا جائے گا!''

لہٰذا اگر دنیا کو کسی بات پر تعجب کرنا چاہیے تو وہ ہمارا یہ طرزِ عمل ہے کہ ایک طرف تو ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہمارا دستور' ہمارا قانون اور ہمارا ضابطۂ حیات اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل ہے' چنانچہ دنیا کے تمام قوانین و دساتیر سے افضل ترین ہے۔ پھر ہم یہ بھی برملا کہتے ہیں کہ اسی پر عمل پیرا ہونے سے دنیا و آخرت کی فوز و فلاح اور خیر و صلاح

حاصل ہو سکتی ہے' لیکن دوسری طرف اس کامل ترین اور افضل ترین دستورِ حیات سے ہماری بے اعتنائی اور روگردانی بھی دنیا سے مخفی نہیں ہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران یہ بھی کہا گیا تھا کہ ''لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان کا دستور کیا ہوگا؟ میں ان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا دستور تو چودہ سو سال پہلے سے طے شدہ ہے!'' —— لیکن عملاً جو کچھ اب تک ہوا اور جو ہو رہا ہے وہ دنیا کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ قابلِ تعجب بات کیا ہوگی کہ جو ملک اس اصول پر قائم ہوا تھا کہ اس کا دستور اور ضابطۂ حیات کتاب و سنت ہوگا' آج اس ملک میں اس دستور کی تنفیذ و نفاذ کا مرحلہ روزِ اول سے بھی بعید نظر آ رہا ہے۔ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو یہ معاملہ اتنا بعید نہیں تھا جتنا آج ہے' حالانکہ یہاں بستے سب مسلمان ہیں۔ سب کے سب قرآن حکیم پر ایمان کے مدعی بھی ہیں اور اسے اپنا دستور' قانون اور ضابطۂ حیات بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اسی قرآن میں ہمارے لیے یہ حکم موجود ہے کہ ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾

''اقامت'' کا مفہوم

''اَقِيْمُوا الدِّيْنَ'' کا ترجمہ ''قائم کرو'' بھی کیا گیا ہے اور ''قائم رکھو'' بھی۔ نتیجے کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دین پہلے سے قائم اور غالب ہے تو اس کو اس حالت پر برقرار رکھنا اقامتِ دین ہے۔ لیکن اگر دین بالفعل قائم نہیں ہے تو اسے دنیا میں قائم اور غالب کرنے کی جدوجہد کرنا اقامتِ دین کا تقاضا ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک ''اقامت'' کا معنی ''سیدھا رکھنا'' ہے' یعنی حکم دیا جا رہا ہے کہ اس دین میں کجی نہ کرو' اس کی کسی چیز کو بدلو نہیں' تمہیں اس میں کسی کمی بیشی اور ترمیم کا اختیار حاصل نہیں' یہ دین تمہیں بطور امانت دیا گیا ہے اور اس کو جوں کا توں رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے! ٹھیک ہے' ''اقامتِ دین'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے' لیکن سیدھی سی بات ہے کہ اسے جوں کا توں رکھنا کس مقصد کے لیے ہوگا؟ اسے صرف کتابوں میں محفوظ کر لینا یا صرف آثارِ قدیمہ کے طور پر محفوظ رکھنا تو مقصود نہیں ہے۔ اس کو محض اپنے نسلی عقیدے کے طور پر مقدس یادگار بنا کر تو نہیں رکھنا ہے۔ بلکہ اگر یہ دین زندگی کے معاملات سے متعلق ہے تو اس کی حفاظت بھی اس کو قائم کرنے کے لیے مقصود ہے' تاکہ تمام معاملات اللہ کی مرضی کے مطابق طے پائیں۔ چنانچہ ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ کا منشاء و مفہوم یہ ہوگا کہ دین کو قائم کرو' اس کی ٹھیک ٹھیک حفاظت کرو' اور اپنے

سارے معاملات اس کے مطابق طے کرو اور اس امر میں تمہارے مابین تفرقہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں اختلاف کی نہ کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی اجازت!

فقہی اختلافات ''تفرقہ'' نہیں

فقہی جزئیات اور فروعات میں حنفی اور شافعی یا دوسرے ائمہ فقہاء کی آراء میں کہیں فرق ہے تو یہ دین کا فرق نہیں' بلکہ صرف شریعت اور قانون کی تعبیر میں آراء کا فرق ہے۔ دین تو ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا۔ اس میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔ اس بارے میں امام ابوحنیفہ' امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے مابین اختلاف امر محال ہے۔ یہ اختلاف تو جملہ انبیاء و رُسل علیہم السلام کے مابین بھی نہیں' بلکہ سب کا دین ایک ہی ہے اور یہ بات سب کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مطاعِ مطلق اور مالکِ حقیقی ہے' وہی اس کائنات کا خالق ہے اور حاکمیت کا حق بھی اُسی کا ہے۔ ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ اور ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ —— ہمارا کام اللہ کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہے۔ اللہ کا عطا کردہ دستور و قانون ہم تک اس کے نبی ﷺ کی وساطت سے پہنچا ہے۔ چنانچہ ہمارا کلمہ دو اجزاء پر مشتمل ہے ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ —— مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ''۔ رسول ﷺ کی حیثیت اللہ کے نمائندے اور اُس کے بندوں کے درمیان رابطے کی ہے۔ چنانچہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول ﷺ کی اطاعت کو بھی لازم قرار دیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ —— پس اس معاملے میں سرے سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں' اس میں تفرقہ ڈالنے' اس کے بارے میں اختلاف کا شکار ہونے اور اس میں اپنی رائے سے جداگانہ راہیں نکالنے سے یہ کہہ کر منع فرما دیا گیا کہ ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾

دینِ حق کا قیام مشرکین پر بھاری ہے

اس کے بعد یہ بات فرمائی گئی:

﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ﴾

''(اے نبی ﷺ!) مشرکوں پر یہ بات بہت بھاری ہے جس کی آپ انہیں دعوت دے رہے ہیں!''

مکی سورتوں کے عام اسلوب کے مطابق یہاں پر خطاب اگرچہ نبی اکرم ﷺ سے ہے' لیکن درحقیقت ہر دَور کے مسلمان اس کے مخاطب ہیں' جو اس دعوت کے داعی بن کر کھڑے ہو جائیں۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنے والے داعیانِ دین اور عَلَم بردارانِ حق سب ہی اس کے مخاطب ہیں۔ یہاں یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ کلمۂ توحید' جو تمہاری دعوت کی بنیاد ہے' بظاہر بڑا ہی بے ضرر سا کلمہ ہے' لیکن اس کے جو لوازم ہیں' اس کے جو متضمنات و مقتضیات ہیں ان کو وہ لوگ خوب سمجھتے ہیں جو شرک پر کاربند ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس ''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کی ضرب ان کے مفادات پر کہاں کہاں پڑے گی۔ ایک سادہ لوح مسلمان کے علم میں شاید یہ بات نہ ہو کہ توحید کی زد کہاں کہاں پڑ رہی ہے' لیکن مشرکین اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے یہ دعوت بہت بھاری ہے اور وہ ٹھنڈے پیٹوں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے کہ اللہ کا دین قائم اور غالب ہو۔

نظامِ شرک

اس موضوع پر مفصل گفتگو تو قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب میں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع اور سورۃ الحج کے آخری رکوع کے درسوں کے ضمن میں ہوتی ہے۔ یہاں مختصر طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ شرک کی دنیا میں ہمیشہ دو نظام رہے ہیں' ایک سیاسی استحصال' اور دوسرا معاشی استحصال اور ان دونوں استحصالی نظاموں نے ہمیشہ مذہب اور دھرم کا لبادہ اوڑھے رکھا ہے۔

سیاسی شرک

اس کی ایک صورت تو یہ رہی ہے کہ کوئی انسان خود خدائی کا دعوے دار بن بیٹھے کہ مرضی میری چلے گی' میں نہیں جانتا کہ خدا کا کیا حکم ہے اور رسول کیا کہتا ہے' اقتدار کا مالک میں ہوں' لہٰذا حکم صرف میرا چلے گا! اس سیاسی شرک کا نام ملوکیت اور آمریت ہے' جس پر کسی قدر گفتگو ''دین الملک'' کی بحث میں ہو چکی۔ اس کی بدترین مثال فرعون اور نمرود نے قائم کی۔ سیاسی شرک کی دوسری صورت' جو موجودہ دَور میں بہت عام ہے' یہ ہے کہ کسی ملک کے عوام اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا انکار کر دیں اور یہ کہیں کہ خدا اور رسول کو ماننا ایک نجی معاملہ ہے۔ جو انہیں مانتے ہیں وہ مسجدوں' مندروں اور کلیساؤں میں ان کا حکم چلا لیں' باقی رہا ملک کا قانون تو وہ

عوام کی اکثریت کی مرضی کے مطابق بننا چاہیے۔ اس کا نام ہے جمہوریت‘ جس پر میں ’’دینِ جمہور‘‘ کے ضمن میں کچھ روشنی ڈال چکا ہوں۔ یہ جمہوریت بھی اسی طرح کا بدترین شرک ہے جس طرح ملوکیت اور آمریت ہے۔

سیاسی شرک کی تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ کوئی ایک قوم حکومت کی مدعی بن کر دوسری قوم کو محکوم بنالے کہ ہم تمہارے آقا ہیں‘ لہٰذا مرضی ہماری چلے گی۔ جیسے انگریز قوم نے ہمیں اپنا محکوم بنا کر ہمارے ساتھ یہ طرزِ عمل روا رکھا تھا۔ انہوں نے بس اس قدر مذہبی آزادی دے رکھی تھی کہ ہم نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ اور حج اپنے دین کے مطابق کرلیں‘ لیکن ملکی قانون (Law of the land) ان کا تھا۔ مرضی اور پسند تاجِ برطانیہ کی چلتی تھی اور وائسرائے ہند اس کا نمائندہ تھا۔ گویا تاجِ برطانیہ ’’الٰہ‘‘ تھا اور وائسرائے اُس کا ’’رسول‘‘ تھا۔ یہ سیاسی شرک کی تیسری صورت ہے۔ چنانچہ سیاسی طور پر کوئی آمر‘ کوئی بادشاہ‘ یا کوئی قوم حاکمیت کے مقام پر فائز ہوجائے اور ملک کے تمام معاشی ذرائع و وسائل اور تمام قومی دولت کو اپنی مرضی اور پسند کے مطابق استعمال کرے تو یہ سیاسی شرک ہے۔

مذہبی شرک

یہ سیاسی شرک ہی کی ایک عظیم فرع ہے‘ جس کو اچھی طرح جان لینا ضروری ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ چند بڑے ہوشیار اور چالاک لوگ دیوی اور دیوتاؤں کے نام پر استھان اور مندر بنا کر یا اولیاء وصلحاء کے نام پر مقبرے‘ تکیے اور درگاہیں بنا کر بیٹھ جاتے ہیں‘ تاکہ ان کے نام پر جو نذرانے آئیں‘ نذریں اور نیازیں چڑھائی جائیں ان سے ان کے حلوے مانڈے چلتے رہیں اور خواہشاتِ نفس پوری ہوتی رہیں۔ وہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ہمیں خوش کرو گے تو یہ دیوی دیوتا تم سے راضی ہو جائیں گے اور یہ بزرگ تمہاری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ اس طرح تمہاری دُنیوی مرادیں بھی بر آئیں گی اور خدا بھی تم سے خوش ہو جائے گا۔

یہ درحقیقت انسانوں کا خون چوسنے کے سیاسی اور مذہبی طریقے ہیں جو ہمیشہ سے دنیا میں جاری رہے ہیں۔ ایک طرف بادشاہ لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہو کر اُن سے خراج وصول کرتے رہے ہیں اور دوسری طرف اس طرح کے چالاک اور ہوشیار لوگ مذہب کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان سے نذرانے وصول کرتے آرہے ہیں۔ یہ لوگ کیسے برداشت

کرلیں گے کہ اللہ کی توحید کا شہرہ ہو اور توحید باری تعالیٰ پر مبنی نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہو جائے؟ اسی لیے فرمایا گیا: ﴿كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ﴾ ’’مشرکوں پر وہ چیز بہت بھاری ہے جس کی دعوت (اے نبی ﷺ!) آپ انہیں دیتے ہیں!‘‘

سیاسی اور مذہبی مشرکین میں تعاون

مشرکین صرف خود ہی شرک نہیں کرتے‘ بلکہ نظامِ شرک کے استحکام کے لیے ایک دوسرے سے بھرپور تعاون (joining hands) بھی کرتے ہیں۔ مشرکین آپس میں ایک دوسرے کے ساتھی بن جاتے ہیں اور ایک شرک دوسرے شرک کو انگیز بھی کرتا ہے‘ لیکن اہل شرک توحید کو کبھی برداشت نہیں کرتے۔ ان کا باہمی گٹھ جوڑ ہوتا ہے کہ کوئی سورج دیوتا کا مندر بنالے‘ کوئی چاند دیوتا کا اور کوئی خود خدائی کا یا خدا کے اوتار ہونے کا دعویٰ کرے اور ’’نِصْفٌ لِّيْ وَنِصْفٌ لَّكَ‘ هٰذَا قَوْمٌ جَاهِلُوْنَ‘‘ کے مصداق دونوں طرف سے لوگوں کو بے وقوف بنا کر لوٹا جائے۔ چنانچہ بے چارے عوام الناس ایک طرف تو بادشاہ کو ٹیکس اور خراج ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف پنڈت‘ پروہت‘ پوپ‘ پجاری اور پیر صاحب ان سے اپنے نذرانے وصول کرتے ہیں۔ دونوں طرف سے تعاون اور خیر سگالی کے طور پر ایک دوسرے کی مدح بھی کی جاتی ہے۔ بادشاہ کی طرف سے ان مذہبی پیشواؤں کو خطابات سے نوازا جاتا ہے اور ان کی طرف سے بادشاہ کو خطابات و القاب دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ پوپ کی طرف سے ’’بادشاہ کے مقدس حق حکمرانی‘‘ (Divine right of the king) کو تسلیم کیا جاتا ہے‘ اور وہ پوپ کے تقدس کے اظہار کے لیے اسے ’’his holiness‘‘ جیسے بڑے بڑے القاب سے نوازتا ہے۔ پروہت اور پنڈت حکمرانوں کا سلسلۂ نسب دیوی دیوتاؤں سے قائم رکھتے ہیں اور بادشاہ سلامت اپنی اطاعت کے ساتھ ان پنڈتوں‘ پجاریوں اور پروہتوں کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں راسخ کرتے ہیں۔ غرضیکہ شرک کے یہ دونوں نظام باہمی گٹھ جوڑ سے ایک دوسرے کو قوت فراہم کرتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کوئی بھی توحید کو کسی صورت برداشت نہیں کرسکتا‘ کیونکہ اس سے ان کی زرگری کی جڑ کٹتی ہے‘ مفادات ختم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کی دعوت مشرکین پر بہت بھاری اور گراں گزرتی ہے۔

مصلح اور رسول کی دعوت کا فرق

یہاں یہ بات بھی وضاحت سے سمجھ لیجیے کہ ایک رسول اور مصلح کی دعوت میں بڑا بنیادی فرق ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف واعظ اور مُعلّمِ اخلاق بن کر کھڑا ہو تو اس کی بات لوگوں پر اتنی گراں نہیں گزرتی جتنی اس شخص کی بات جو اس بات کا داعی بن کر اٹھے کہ میں اس پورے نظامِ باطل کو‘ جو غیر اللہ کی اطاعت پر قائم ہے اور جس کی اساس شرک پر ہے‘ بالکل نیست و نابود کر دوں گا اور اللہ کی اطاعت پر مبنی نظام قائم کروں گا۔ یہ دعوت ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کی جاتی۔ اس لیے کہ غیر اللہ کی اطاعت اور مشرکانہ بنیادوں پر قائم نظامِ باطل سے کچھ لوگوں کے سیاسی و معاشی مفادات اور مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ وہ پیچ در پیچ ایسے بندھنوں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر یہ نظام تلپٹ ہوا تو یہ سب کچھ بدل جائے گا‘ بہت سے اوپر والے نیچے اور نیچے والے اوپر ہو جائیں گے۔ اس طرح ہمارے مفادات پر ضرب پڑے گی اور ہماری سیاست و چودھراہٹ ختم ہو جائے گی‘ ہمارا وقار اور احترام خاک میں مل جائے گا اور ہمارا اعتماد جاتا رہے گا۔ اس لیے توحید پر مبنی اسلام کے عادلانہ نظامِ اجتماعی کے قیام کی دعوت مشرکانہ نظام کے مقتدروں‘ سرداروں اور مہنتوں کو کبھی برداشت نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر آپ کسی جزوی اصلاح کی دعوت لے کر اٹھیں‘ ریفارمر کی حیثیت اختیار کریں یا دین کی محض وہ باتیں پیش کریں جن سے کسی کے مفاد پر زد نہ پڑتی ہو تو پھر آپ کی کسی طرف سے کوئی مخالفت نہیں ہوگی‘ بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو پھولوں کے ہار پہنائے جائیں‘ آپ کا شاندار استقبال کیا جائے اور آپ کی خدمت میں سپاس نامے پیش کیے جائیں۔

اہلِ ایمان کو تسلی

آگے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿١٣﴾﴾

’’اللہ جسے چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور اپنی طرف (یعنی اپنے دین پر) آنے کا راستہ اس پر کھول دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔‘‘

آیتِ کریمہ کے اس ٹکڑے کے پس منظر میں اس پوری کشمکش اور پورے تصادم کی جھلک نظر آتی ہے جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے سلسلے میں اللہ کے نبی ﷺ اور مشرکین کے درمیان

چل رہا ہے۔ مشرکین کو کسی درجے میں یہ گوارا نہیں کہ یہ مشرکانہ نظام ختم ہو جائے اور پوری کی پوری زندگی ایک اللہ کی اطاعت کے نظام کے تحت آ جائے۔ چنانچہ وہ مزاحمت اور مخالفت پر کمربستہ ہیں اور ان کی دن رات یہ کوشش ہے کہ دینِ حق کا یہ چراغ گُل کر دیا جائے۔ ان انتہائی مایوس کن حالات میں نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ اس شدید مزاحمت و مخالفت اور تشدد سے دل برداشتہ نہ ہوں‘ اللہ تعالیٰ یقیناً راستہ کھولے گا اور بہت سے لوگوں کو‘ جنہیں وہ چاہے گا‘ اپنے دین کی طرف کھینچ لے گا۔ اس کے علاوہ جن لوگوں میں ذرا بھی اِنابت ہے‘ جو حق کے طالب اور جویا ہیں‘ ان کو بھی راہِ ہدایت سے بہرہ مند فرمائے گا۔ اس اجتباء اور ہدایت اِلی اللہ کی جھلک مسلمان ان آیات کے نزول سے پہلے بھی دیکھ چکے تھے اور اس کے بعد بھی اس کے مناظر اُن کے سامنے آتے رہے۔

’’اجتباء‘‘ کی مثالیں

اجتباء کا صحیح مفہوم ہے کسی کو کسی مقصد کے لیے پسند کر لینا‘ چُن لینا اور کھینچ لینا۔ یہاں جو فرمایا گیا: ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے) اس مفہوم کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے: ’’اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے دین کی خدمت کے لیے پسند کر لیتا ہے‘ چن لیتا ہے!‘‘ اس اجتباء کی دو درخشاں مثالیں ملاحظہ ہوں۔

پہلی مثال حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب کا قبولِ اسلام ہے۔ آنجنابؓ توحید و شرک کی کشمکش سے بے نیاز روز و شب اپنے مشاغل میں مصروف رہتے تھے‘ جن میں سب سے زیادہ نمایاں شوق تیراندازی اور شکار کا تھا۔ علی الصبح تیر کمان لے کر شکار کو نکل جانا اور شام کو واپس آنا ان کا معمول تھا۔ ایک روز ابوجہل نے رسول اللہ ﷺ سے زیادتی کی اور یہ زیادتیاں اس وقت اس کے معمول میں شامل ہو چکی تھیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شام کو واپس لوٹے تو اُن کی ایک لونڈی نے انہیں اس زیادتی کا ماجرا سنایا۔ قرابت داری کے جذبے نے جوش کھایا اور اسی وقت جا کر اپنی کمان ابوجہل کے سر پر دے ماری۔ یہی جذبہ ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا ذریعہ بن گیا اور حمزہ بن عبدالمطلب نبی اکرم ﷺ کے جاں نثاروں میں شامل ہو گئے۔ آپؓ بارگاہِ رسالتؐ سے ’’اَسَدُ اللّٰهِ وَاَسَدُ رَسُوْلِهٖ‘‘ اور ’’سَیِّدُ الشُّهَدَاء‘‘ کے القاب سے سرفراز ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔

دوسری درخشاں مثال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے دو

اشخاص کے متعلق یہ دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ! عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے کسی ایک کو شرفِ قبولیت عطا فرما! اللہ تعالیٰ نے عمر بن الخطاب ؓ کو چن لیا اور وہ عمر فاروق ؓ بن گئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ ـــــ اسلام قبول کرنے سے قبل ان کی طبیعت میں غور وفکر کا کوئی مادہ، تلاشِ حق کا کوئی داعیہ یا کوئی ایسی علامت دکھائی نہ دیتی تھی جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہو کہ وہ خود سیدھی اور سچی راہ کے جویا تھے۔ بلکہ طبیعت میں لاابالی پن اور بے پرواہی تھی۔ نبی اکرم ﷺ کو دعوتِ حق دیتے ہوئے چھ برس گزر چکے تھے مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی، بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر تعصب سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا اور رسول اللہ ﷺ سے عداوت اور آپؐ کی دعوت سے بیزاری بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ننگی تلوار لے کر آنحضرت ﷺ کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشا اور ایسے حالات پیدا فرما دیے کہ پتھر دل موم ہو گیا۔ وہ عمرؓ جو نبی اکرم ﷺ کے قتل کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے غلامانِ محمدؐ میں شامل ہو گئے اور ان کی یہ شان قرار پائی کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ((لَوْ كَانَ بَعْدِيْ نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ))(۱) ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر بن الخطاب ہوتے!'' ـــــ تو یہ ہے اجتباء۔

بیعتِ عقبۂ اولیٰ کے موقع پر یثرب (مدینہ) سے مکہ آنے والوں میں سے کچھ سعید روحوں کو اللہ تعالیٰ نے دولتِ اسلام سے مشرف کر دیا، وہ بھی ایک نوعیت کا اجتباء ہے۔ یہ لوگ جاہلیت کے رسم ورواج کے تحت حج اور عمرے کے لیے مکہ آئے تھے اور کوئی طلبِ ہدایت اور تلاشِ حق ان کے پیش نظر نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے سینے قبولِ ایمان کے لیے کھول دیے اور وہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت سے متاثر ہو کر مؤمنینِ صادقین کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ ان حضرات گرامی کی یہ بیعت ہی یثرب کے مدینۃ النبیؐ بننے اور دارالہجرت قرار پانے کی تمہید بن گئی ـــــ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ!

ہدایت کا حق دار کون؟

دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا ایک قاعدہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ جو بھی حق کا متلاشی ہو گا، جس

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب فی مناقب عمر بن الخطاب۔ راوی عقبہ بن عامر ؓ۔

کے دل میں بھی انابت ہو گی اس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کا راستہ ضرور دکھا دے گا۔ اس نے اس میں ''پسند'' کا معاملہ نہیں رکھا، بلکہ فرمایا: ''يَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ'' کہ جس میں حق کی سچی طلب ہو، جو بھی انابت کی روش اختیار کرے، اس پر ہدایت کی راہ کھول دی جاتی ہے۔ اسی قاعدے کو سورۃ العنکبوت کے آخر میں یوں بیان فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (آیت ۶۹) ''وہ لوگ جو ہماری راہ میں مشقتیں اٹھاتے ہیں (جن میں حق کی طلب اور جستجو ہوتی ہے) تو ہم لازماً ان کے لیے اپنے راستے کھولتے چلے جائیں گے''۔ پس معلوم ہوا کہ جن میں انابت ہوتی ہے، جو کسی تعصب اور عصبیت میں مبتلا نہیں ہوتے، جن کے دلوں میں حق کی سچی طلب ہوتی ہے، جن کی فطرت سلیم ہوتی ہے، جو چاہتے ہیں کہ ان پر حق منکشف ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے۔

شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیروں، بد سے بدتر نظام اور خراب سے خراب تر ماحول میں بھی ایسی سعید روحیں موجود ہوتی ہیں جن کی قلبی کیفیت کو سورۂ آل عمران میں ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا: ﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا﴾ (آیت ۱۹۳) ''اے ہمارے پروردگار! یقیناً ہم نے ایک پکارنے والے (کی دعوت) کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا کہ اپنے ربّ پر ایمان لاؤ، پس ہم ایمان لے آئے۔''

حضرت ابوبکر صدیق ؓ اس کی سب سے بڑی درخشاں مثال ہیں۔ وہ اپنی فطرتِ سلیمہ اور طلبِ حق کی بنیاد پر صدیقِ اکبر کے ارفع واعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ، حضرت سعید بن زیدؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) جو عشرۂ مبشرہ میں شامل ہیں، اسی انابت الی اللہ کے طفیل سے دولتِ ایمان سے مالا مال ہوئے ہیں۔ تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ ہر دَور میں ایسی سعید روحیں موجود ہوتی ہیں جو حق کی متلاشی ہوتی ہیں۔ حضرت سلمان فارسی ؓ کے ایمان لانے کے واقعہ پر غور کیجیے۔ طلبِ حق میں کہاں سے روانہ ہوئے، کن کن منزلوں پر ٹھہرے اور پھر کس طرح منزلِ مقصود تک پہنچے۔ اسی طرح طالبانِ حق کہاں کہاں سے آ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور شرفِ صحابیت سے مشرف ہوئے ـــــ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم اجمعین!!

تفرقہ کا اصل سبب

جیسا کہ پہلی آیت میں بیان ہوا‘ تمام سابقہ اُمتوں کو یہ حکم ہوتا رہا ہے کہ ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ کہ دین کو قائم کرو اور اس کے بارے میں تفرقے میں مت پڑو! اب اگلی آیت میں اس کا سبب بیان کیا جا رہا ہے کہ جب دین ایک ہے تو پھر تفرقہ کیوں ہوا؟ یہودیت نے ایک علیحدہ راہ کیوں نکالی اور عیسائیت نے علیحدہ راہ کیوں؟ ہر سلیم العقل انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہود و نصاریٰ تو توحید سے بھی واقف تھے اور وحی‘ بعثت انبیاء و رُسل‘ انزالِ کتب سماوی‘ بعث بعد الموت اور محاسبۂ اُخروی کے عقائد سے بھی واقف تھے۔ یہ امور اُن کے لیے اجنبی نہ تھے۔ ان کے برعکس اہلِ عرب اُمی شمار ہوتے تھے اور وہ ان عقائد سے آگاہ نہ تھے۔ تو پھر اہلِ کتاب نے آگے بڑھ کر اس دعوت کو قبول کیوں نہیں کیا؟ بلکہ اس کی مزاحمت و مخالفت میں مشرکین سے بھی زیادہ شدید کیوں ہو گئے؟ اس کا سبب معلوم ہونا ضروری ہے۔ عام طور پر تفرقے کے دو اہم سبب ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ جب حق آئے تو وہ واضح نہ ہو اور دوسرا یہ کہ باہمی ضدّم ضدّا اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لیے حق کا انکار کیا جائے اور تفرقے کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اگلی آیت میں قرآن مجید پہلے سبب کی نفی اور دوسرے سبب کا اثبات کر رہا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ﴾

''اور لوگوں نے تفرقہ نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ اُن کے پاس علم آ چکا تھا‘ صرف اس لیے کہ وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔''

پس معلوم ہوا کہ ان کے تفرقے کا اصل سبب ناواقفیت نہیں بلکہ ان کی ضد اور سرکشی تھی۔ ان کے پاس ''العلم'' آ چکا تھا‘ یعنی ہدایتِ ربانی ان کو پہنچ چکی تھی‘ حق ان پر واضح ہو چکا تھا۔ اور حق تو جب بھی آتا ہے بہت واضح اور مبرہن ہو کر آتا ہے‘ بیّنہ بن کر آتا ہے۔ سورۃ البیّنۃ میں اس مضمون کو مزید واضح کیا گیا:

﴿وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۴﴾

''اور نہیں تفرقہ کیا ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی تھی مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس ''البیّنہ'' آ چکی تھی۔''

یعنی حق روشن اور مبرہن صورت میں ان کے سامنے پیش کیا جا چکا تھا۔ لہٰذا تفرقے کا اصل سبب لاعلمی اور ناواقفیت نہیں‘ بلکہ کچھ اور ہی ہے۔ چنانچہ اس تفرقے کے حقیقی سبب کو ''بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ'' کے الفاظ سے واضح کیا گیا کہ اس کا اصل محرک آپس کی ضد‘ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی خواہش ہے۔ یا پھر قومی مفادات‘ قومی تفاخر‘ گروہی مناصب‘ ذاتی وجاہت و حشمت اور دُنیوی اغراض و مصالح کی خاطر حق سے اعراض کی روش اختیار کی جاتی ہے۔

اہلِ کتاب کے علاوہ سردارانِ قریش بھی اسی ضد کے سبب سے آنحضور ﷺ کی دعوت پر ایمان نہ لائے اور دینِ حق کی راہ میں مزاحم رہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال ابوجہل کا وہ قول ہے جو اُس نے اس وقت کہا جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا تمہارے خیال میں محمدؐ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں؟ اس نے جواب میں کہا تھا: نہیں‘ انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ـــــ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنی ہاشم کے مابین ایک خاندانی مسابقت چل رہی تھی۔ بنو ہاشم نے مہمان نوازیاں کیں‘ ہم نے ان سے بڑھ کر کیں۔ انہوں نے حجاج کو کھانے کھلائے‘ ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے۔ انہوں نے ضیافت کے لیے اونٹ ذبح کیے‘ ہم نے ان سے زیادہ تعداد میں کیے۔ اس مسابقت میں اب تک ہم نے ان سے مات نہیں کھائی تھی‘ لیکن اب اگر ہم محمد (ﷺ) کی نبوت مان لیں اور ان کی رسالت کو تسلیم کر لیں تو ہم پر بنی ہاشم کی برتری ابدالآباد تک قائم ہو جائے گی! چنانچہ اس کی اس بات سے مخالفت اور تفرقہ کا اصل سبب واضح ہوتا ہے۔

یہی معاملہ یہود کا ہوا۔ قرآن مجید کی شہادت یہ ہے کہ: ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ (البقرۃ:۱۴۶‘ الانعام:۲۰) ''جن کو ہم نے کتاب عطا فرمائی‘ وہ انہیں (یعنی رسول اللہ ﷺ کو) اس طرح پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہوں!'' یہود نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کسی مغالطے کی بنا پر نہیں کیا تھا‘ بلکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ وہی آخری نبی ہیں جن کی بشارتیں اور پیشین گوئیاں وہ سنتے چلے آ رہے تھے اور جن کی آمد کے وہ منتظر تھے۔ اسی طرح عیسائی بھی آنحضور ﷺ کی آمد کی پیشین گوئیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ایک عیسائی راہب نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع دی تھی کہ جنوب میں کھجوروں کے جھنڈ میں نبیٔ آخر الزماں کا ظہور ہوگا‘

اگر حقیقی ہدایت اور حق کی طلب ہے تو وہاں پہنچو اور ان کی بعثت کا انتظار کرو! یثرب اور اس کے قرب و جوار میں رہنے والے یہودی اوس و خزرج کے قبیلوں کو دھمکایا کرتے تھے کہ ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے‘ اور ہم جب اس کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں گے تو تم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکو گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہودیوں کی یہی دھمکی بیعتِ عقبۂ اُولیٰ کا سبب بن گئی‘ جس کا حوالہ اجتباء کی مثالوں کے ضمن میں دیا گیا ہے۔ جب مدینہ کے کچھ لوگ مکہ پہنچے اور ان کو حضور ﷺ کی دعوتِ نبوت کا علم ہوا تو ان میں سے ایک شخص نے کہا کہ جلدی کرو اور اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لو۔ یہ وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی آمد کے یہود منتظر بیٹھے ہیں‘ مبادا وہ ہم سے سبقت لے جائیں۔ اس طرح نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے اور پھر آپؐ کے اعوان و انصار بننے کی سعادت اہلِ مدینہ کے حصے میں آئی‘ لیکن یہود کی بدبختی آڑے آئی اور وہ دولت ایمان سے محروم رہے۔ اس لیے کہ ان کی عزتِ نفس پر یہ چوٹ پڑی کہ نعمتِ نبوت بنی اسرائیل سے چھن گئی اور یہ اعزاز بنی اسماعیل کو حاصل ہو گیا کہ نبی آخر الزماں ان میں مبعوث کیے گئے۔ ان کا یہی تعصب‘ ضد‘ ہٹ دھرمی اور نسلی برتری کا احساس ان کے پاؤں کی بیڑی بن کر رہ گیا اور محرومی ان کا مقدر ٹھہری۔ اسی لیے فرمایا گیا:

﴿وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ﴾

کہ انہوں نے جو تفرقہ و اختلاف کیا تو وہ کسی مغالطے یا ناواقفیت کی بنا پر نہیں‘ بلکہ ہدایتِ ربانی کے واضح طور پر پہنچ جانے کے بعد محض اپنے نفس کی شرارت و سرکشی اور باہمی ضد کا نتیجہ ہے!

’’اجلِ مسمّٰی‘‘ کا قانون

آگے فرمایا:

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِىَ بَيْنَهُمْ ؕ﴾

’’اور اگر نہ ہوتی ایک بات جو نکل چکی تیرے ربّ کی طرف سے ایک وقتِ مقرر تک تو اُن کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا۔‘‘

واضح رہے کہ سورۃ الشوریٰ مکی سورت ہے‘ اور یہاں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ خاطر جمع رکھئے‘ اللہ کا فیصلہ آ کر رہے گا‘ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو کر رہے گا۔ لیکن اس میں ابھی وقت لگے گا‘ کیونکہ ہر چیز کے انجام کے لیے اللہ کا مقرر کردہ ایک اندازہ

اور ضابطہ ہے۔ اس فیصلے کے لیے بھی اللہ کی طرف سے ایک میعاد مقرر ہے‘ اور جب تک وہ گھڑی نہیں آتی تب تک منتظر رہنا پڑے گا!

قرآن کے آئینے میں ہماری تصویر

قرآن حکیم کے بارے میں خود قرآن ہی کے الفاظ ہیں: ﴿فِيْهِ ذِكْرُكُمْ﴾ (الانبیاء: ۱۰) ’’اس میں تمہارا ذکر موجود ہے‘‘۔ چنانچہ آیتِ زیر درس کے اگلے حصے میں قرآن ہمارے سامنے ہماری ہی تصویر پیش کر رہا ہے۔ تو آیئے‘ آئینۂ قرآنی میں اپنی تصویر دیکھئے‘ اور اگر یہ تصویر بری نظر آئے تو آئینے کو الزام مت دیجیے‘ کیونکہ آئینہ تو حقیقت کی عکاسی کرتا ہے‘ بلکہ اپنی شکل کو درست کرنے کی فکر کیجیے! فرمایا:

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾﴾

’’اور وہ لوگ جو کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد وہ درحقیقت اس کے بارے میں سخت الجھن میں ڈالنے والے شک میں مبتلا ہیں۔‘‘

اس وقت قرآن کے ساتھ ہمارا جو معاملہ ہے وہ اس آیت کا مصداقِ کامل ہے۔ اور یہ درحقیقت اس بات پر ہمارا ایمان مضمحل ہو جانے کا نتیجہ ہے کہ قرآن واقعی اللہ کی کتاب ہے‘ ورنہ یہ ناممکن اور محالِ عقلی ہے کہ ایک طرف ہمارا یہ یقین ہو کہ یہ مالکِ ارض و سماء کا کلام ہے جس کے حضور ہمیں پوری زندگی کے اعمال کی جوابدہی کے لیے حاضر ہونا ہے اور دوسری طرف ہم اس سے اعراض اور گریز کا طرزِ عمل بھی روا رکھیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمیں یہ یقین ہو کہ یہ کتاب ہماری زندگی کے ایک ایک گوشے کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے اور پھر بھی نہ اسے پڑھنے کا ہمارے پاس وقت ہو اور نہ اسے سمجھنے کی ہمیں ضرورت محسوس ہو؟ ہم سب کچھ پڑھیں‘ انگریزی ادب میں سکالر ہو جائیں‘ دنیا بھر کے علوم و فنون حاصل کر لیں‘ ڈاکٹری اور انجینئرنگ کی ڈگریاں حاصل کرنے کے لیے عمرِ عزیز کے کئی قیمتی سال صرف کر دیں‘ لیکن اگر عربی پڑھنے اور قرآن حکیم کو سمجھنے کی توفیق نہ ہوئی ہو تو یہ دعویٰ کیسے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید پر ہمارا ایمان ہے؟ یہ قرآنی تشخیص ہے جو ان الفاظ میں بیان فرمائی گئی ہے کہ:

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِىْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۴﴾﴾

قرآن کا اعجاز ملاحظہ ہو کہ اس کیفیت کے لیے لفظ ’’شک‘‘ پر اکتفا نہیں کیا‘ بلکہ اس کے

ساتھ ''ریب'' کا لفظ بھی استعمال فرمایا کہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم جس حالت میں مبتلا ہو وہ محض شک کی نہیں' بلکہ تمہارے شکوک میں بہت ہی اضطراب انگیز شبہات بھی ہیں' اس لیے کہ تمہاری عملی تصویر اس کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔

رسالت کا ایک اہم تقاضا: دعوت

اگلی آیت آج کی گفتگو کے مرکز ومحور اور عمود کی حیثیت کی حامل ہے اور اس پر کافی غور و تدبر کی ضرورت ہے۔ آیت اپنے حجم کے لحاظ سے بھی طویل ہے اور بہت سے مضامین پر محیط ہے۔ ان میں سے ہر مضمون پر ان شاء اللہ الگ الگ گفتگو بھی ہوگی۔ فرمایا:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۵﴾

''پس (اے نبی ﷺ! حالات کی اس ناسازگاری کے باوصف آپؐ کے منصبِ رسالت کی ذمہ داری یہ ہے کہ) آپ اسی (توحید اور دین اسلام) کی دعوت دیتے رہیں' اور جیسا کہ آپؐ کو حکم دیا گیا ہے آپ خود بھی (توحید اور دین کے تقاضوں پر) مضبوطی سے قائم رہیں' اور ان (مشرکین و کفار) کی خواہشات کا اتباع نہ کریں' اور (ان سے صاف صاف) کہہ دیں کہ میں ہر اُس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل فرمائی ہے' اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل (کا نظام قائم) کروں۔ اللہ ہی ہمارا مالک اور پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے۔ ہمارے اور تمہارے درمیان (اس بات پر) کسی حجت (دلیل بازی اور جھگڑے) کی ضرورت نہیں' اللہ ایک دن ہم سب کو (میدانِ حشر میں) جمع کر دے گا اور (انجامِ کار کے لحاظ سے) اسی کی طرف پھر جانا ہے!''

یہ آیتِ مبارکہ واضح طور پر دلالت کر رہی ہے کہ اس کے مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں۔ آیت کے آغاز میں آنے والے کلمہ ''فا'' اور ''لام'' غایت نے ذٰلِكَ سے مل کر اس آیت کا ماسبق کی آیات سے بھی مکمل ربط قائم کر دیا ہے اور اس حکم کا مقصد بھی بیان کر دیا ہے۔ نیز اسے اُس پس منظر سے بھی مربوط کر دیا ہے جو اس پوری سورۃ الشوریٰ کے نزول کے وقت موجود تھا'

جس کی چند آیات کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ سورۂ مبارکہ مکی دَور کے وسط کی سورتوں میں سے ایک ہے۔ زمانۂ نزول کے پس منظر میں جو کچھ ہو رہا تھا اسے پیشِ نظر رکھئے۔ مسلمانوں' بالخصوص نوجوانوں اور غلاموں کے طبقے میں سے ایمان لانے والوں پر ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کو بھی ہر قسم کی اذیتیں دی جا رہی تھیں۔ یثرب (مدینہ) میں یہودیوں کے مضبوط گڑھ تھے۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی دعوت ان تک بھی پہنچ چکی تھی' لیکن وہ حاملِ کتاب ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود دعوتِ حق کو مٹانے کے لیے مشرکین سے ریشہ دوانیاں کر رہے تھے۔ نجران میں نصاریٰ بھی موجود تھے اور ان کی ایک مختصر تعداد مکہ میں بھی موجود تھی۔ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے اور نصاریٰ نے بھی دین کو بدل دیا تھا۔ انہوں نے شریعت کو ساقط کر دیا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ قرار دے دیا تھا۔ یہود و نصاریٰ میں واضح اختلاف کے علاوہ ان میں سے ہر گروہ میں کئی کئی فرقے تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ مکہ میں قریش اپنے آپ کو حضرت ابراہیم و اسماعیل (علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) سے منسوب کرتے تھے' لیکن انہوں نے دین ابراہیمی کا حلیہ بگاڑ چھوڑا تھا۔ انہوں نے بیت اللہ شریف کو' جو خدائے واحد کی عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا تھا' صنم کدہ بنا دیا تھا اور اس میں تین سو ساٹھ بُت رکھ چھوڑے تھے۔ کعبہ کا طواف عریاں حالت میں کرنے کو بڑی نیکی کا عمل قرار دیتے تھے۔ اخلاقی طور پر رذائل و ذمائم کا کوئی شمار ہی نہ تھا۔ اس صورتِ حال میں بھی نبی اکرم ﷺ کو ہدایت دی گئی کہ: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ﴾۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ فَلِذٰلِكَ سے پس منظر بھی مراد ہے اور اس آیت کی طرف بھی اشارہ ہے' جس سے اس گفتگو کا آغاز ہوا تھا' یعنی:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ﴾

''اُس (اللہ) نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم نوح (علیہ السلام) کو دیا تھا اور جو ہم نے (اے نبی ﷺ) آپ کی طرف وحی کیا ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو دیا تھا کہ دین کو قائم کرو اور اس بارے میں تفرقہ میں مت پڑو!''

یہاں پھر نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ

اُمِرْتَ ۚ﴾ یعنی صیغۂ امر میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپؐ اسی دین کی دعوت دیتے رہیے اور جیسا کہ آپؐ کو حکم دیا گیا ہے‘ اس پر مضبوطی سے جمے رہیے۔ یہ مشرکین و کفار اسے قبول کریں یا نہ کریں‘ تصدیق کریں یا تکذیب کریں‘ منظور کریں یا ردّ کریں‘ خواہ گالیاں دیں‘ پتھر ماریں‘ ایذائیں پہنچائیں اور جان کے دشمن بن جائیں‘ آپؐ کے فرضِ منصبی کے اعتبار سے آپؐ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ آپؐ اسی کی دعوت دیتے رہیں‘ کیونکہ دین کی دعوت آپؐ کا فرضِ منصبی ہے۔ ’’وَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ‘‘ کے الفاظ میں اس بات کی مزید تاکید کی گئی کہ اس سے آپؐ ایک انچ بھی نہیں ہٹ سکتے‘ آپؐ کو اس پر جمے رہنا ہے‘ کوئی مصلحت‘ کوئی مشکل‘ کوئی مصیبت‘ کوئی نقصان‘ کوئی خطرہ اور کوئی صدمہ اس دعوت سے منحرف ہونے کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتا‘ کیونکہ آپؐ اس دعوت پر مامور ہیں۔ آپؐ اپنی مرضی سے تو نبوت و رسالت کا دعویٰ نہیں کر رہے‘ آپؐ نے اپنی سوچ سے تو اس دعوت کا آغاز نہیں کیا۔ یہ دعوت من جانب اللہ ہے۔ آپ اللہ کے رسول اور فرستادہ ہیں‘ لہٰذا آپؐ اس منصبِ رسالت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں لگے رہیے! —— آنحضورﷺ کو علی الاعلان دعوت پیش کرنے کا حکم ایک دوسرے اسلوب سے سورۃ الحجر میں بایں الفاظ دیا گیا:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۹۴﴾

’’پس (اے نبیﷺ!) آپؐ کو جس (دعوت) کا حکم دیا جا رہا ہے اس کو ڈنکے کی چوٹ پیش کیجیے اور شرک کرنے والوں کی (مخالفت و مزاحمت کی) بالکل پرواہ نہ کیجیے!‘‘

مصالحانہ رویہ کی ممانعت

آیت زیر درس کا اگلا ٹکڑا ہے: ﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ﴾ ’’اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔‘‘ اس ٹکڑے کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ہمیں پھر اس ماحول اور پس منظر کی طرف رجوع کرنا ہوگا جس میں یہ ہدایت دی گئی۔ مکی دَور کے قریباً نصف میں ایسی فضا پیدا ہوگئی تھی کہ جب قریش کے مشرک سرداروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے ان کی ساری کوششیں ناکام ہوگئی ہیں اور اس دعوت کو ظلم و تشدد اور ایذا رسانی کے ذریعے سے دبانا ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بھی ہر طرح سے ستا کر دیکھ لیا تھا اور آپؐ کے جاں نثار اہل ایمان پر بھی تشدد کے پہاڑ توڑے تھے۔ جو کچھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ‘ حضرت خباب بن

ارت رضی اللہ عنہ اور آلِ یاسر رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہوا اس کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ حضرت بلالؓ کو تپتی دھوپ میں مکہ کی سنگلاخ زمین پر مُنہ کے بل گھسیٹا جاتا تھا‘ لیکن ان کی زبان پر کسی فریاد‘ کسی فغاں یا کسی آہ و بکاء کے بجائے بس اَحد‘ اَحد کا کلمہ جاری رہتا۔ حضرت خبابؓ کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا‘ ان کے گوشت کے جلنے اور چربی کے پگھلنے سے انگارے ٹھنڈے ہوتے‘ مگر وہ صبر و ثبات کی چٹان بنے رہے۔ حضرت یاسرؓ کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں چار سرکش اونٹوں کے ساتھ باندھ کر انہیں مخالف سمتوں میں دوڑا دیا گیا جس سے آپؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو ابوجہل لعین نے شرمگاہ میں نیزہ مار کر شہید کر ڈالا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیا کرتے تھے جس سے دم گھٹنے کے قریب ہو جاتا تھا۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مادرزاد ننگا کر کے گھر سے نکال دیا گیا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی والدہ نے بھوک ہڑتال کر دی تھی کہ اگر سعد اپنے آبائی دین پر واپس نہ آیا تو میں بھوکوں مر جاؤں گی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو کئی بار اتنا مارا پیٹا جاتا کہ جان کے لالے پڑ جاتے تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین —— غرضیکہ اہلِ ایمان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا‘ یہاں تک کہ کچھ لوگ حضورﷺ کی اجازت سے ترکِ وطن کر کے حبشہ ہجرت کر گئے۔

جب قریش نے یہ دیکھ لیا کہ مسلمانوں کو ہر ممکن طریقے سے ستانے‘ تکلیفیں پہنچانے اور ظلم و تشدد کی انتہا کر دینے کے باوجود ان میں سے کوئی بھی اس دین سے واپس نہیں پلٹا‘ تب انہوں نے باہمی مشاورت سے فیصلہ کیا کہ اب رسول اللہ ﷺ سے مصالحت کے لیے بات چیت کرنی چاہیے۔ اگر یہ کچھ باتیں ہماری مان لیں اور کچھ ہم ان کی مان لیں تو ہماری ناک بھی نیچی نہیں ہوگی اور ایک مصالحانہ فضا بھی پیدا ہو جائے گی۔ ویسے کچھ لوگ تو اس طرح کی مصالحت کی ضرورت آنحضورﷺ کی دعوت کے آغاز ہی سے محسوس کر رہے تھے اور اس کے لیے کوشش بھی کرتے رہے تھے‘ جس کی طرف سورۂ ن (سورۃ القلم) میں اشارہ موجود ہے‘ جو دعوت کے آغاز کی سورت ہے۔ وہاں آنحضورﷺ کو ان کی چالوں سے بایں الفاظ مطلع فرما دیا گیا تھا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۸ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۝۹﴾

''پس (اے نبی ﷺ!) آپ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ آپؐ مداہنت کریں تو یہ بھی مداہنت کا رویہ اختیار کریں۔''

جن لوگوں نے سیرتِ مطہرہ کا مطالعہ کیا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ سردارانِ قریش کی جانب سے آنحضور ﷺ کے پاس وقتاً فوقتاً سفارتیں آتی رہی ہیں اور آپؐ کو مختلف اوقات میں مختلف پیشکشیں کی جاتی رہی ہیں۔ آپ ﷺ سے کہا گیا کہ اگر آپؐ کو اس دعوت کے ذریعے دولت چاہیے تو آپؐ اشارہ کر دیجیے' ہم آپؐ کے قدموں میں زر و سیم اور جواہر کے انبار لگا دیں گے۔ اگر آپؐ کو اقتدار کی خواہش ہے اور آپؐ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ـــــ اگرچہ ہم قبائلی زندگی کے عادی ہیں اور بادشاہت کا نظام ہمارے مزاج اور طبیعت سے میل نہیں کھاتا' پھر بھی ـــــ ہم آپؐ کو بادشاہ بنانے کے لیے تیار ہیں۔ اگر آپ کسی خاص خاتون سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو اشارہ کر دیجیے' وہ خاتون چاہے کسی خاندان کی ہو' آپؐ کی زوجیت میں دے دی جائے گی۔ انہوں نے مزید پیشکش کی کہ آپؐ جس طرح نماز پڑھنا چاہیں' اپنے معبود کی عبادت کرنا چاہیں' ہم مزاحم نہیں ہوں گے۔ ان تمام پیشکشوں کے عوض ہم بس اتنا چاہتے ہیں کہ آپؐ ہمارے آبائی دین کو' ہمارے بُتوں' ہمارے اس مشرکانہ نظام کو برا کہنا چھوڑ دیں' اس پر تنقید کرنا ترک کر دیں۔ ان تمام پیشکشوں کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے جو جواب دیا وہ اگر تاریخ میں آبِ زر سے لکھا جائے تب بھی اس کی عظمت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دو تب بھی میں اس دعوت سے باز نہیں آ سکتا۔ یا تو میں اس دعوت کی تبلیغ میں اپنی جان دے دوں گا یا اللہ تعالیٰ اس کو کامیابی سے ہمکنار فرمائے گا!''

اس پورے تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر ان الفاظِ مبارکہ کی معنویت پوری طرح واضح ہوتی ہے: ﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ یعنی اے نبی ﷺ! آپ اپنی دعوت پر ڈٹے رہیے اور اس دینِ حق کی طرف بلاتے رہیے جس کا آپؐ کو حکم دیا گیا ہے۔ یہ مشرکین دامِ ہم رنگ زمیں بچھا کر چاہتے ہیں کہ مصالحت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ کچھ لینے اور دینے (give & take) کا معاملہ ہو جائے' لیکن آپؐ کو

ان کی خواہشاتِ باطلہ کی پیروی کرنے' اپنی دعوت میں کوئی لچک پیدا کرنے اور اپنے موقف میں کوئی کمزوری ظاہر کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ کوئی مانے تو اپنے بھلے کو' نہ مانے تو اس کا وبال بھی اسی کے سر ہے۔ ﴿وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۱۲﴾ (لقمان) اللہ تعالیٰ بڑا غیور ہے' وہ الصمد ہے' وہ الغنی ہے' وہ ستودہ صفات ہے' وہ اس بات کا محتاج نہیں کہ لوگ اگر اس کا دین صدفی صد نہیں مانتے تو چلو پچاس فی صد یا کم و بیش پر ہی معاملہ کر لیا جائے ـــــ نہیں' بلکہ اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ: ﴿اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠﴾ (البقرۃ:۲۰۸) کہ دینِ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ! اس کے دین کو قبول کرنا ہے تو اسے پورا پورا قبول کرنا ہوگا' اس کے لیے اللہ کے دین میں باطل کی ذرا سی بھی آمیزش ہو گئی تو دین خالص نہ رہے گا اور یوں اللہ کے اس حکم کی خلاف ورزی ہو جائے گی: ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۭ﴾ (الزمر:۳) ''آگاہ ہو جاؤ' دینِ خالص (اطاعتِ کُلی) صرف اللہ کا حق ہے'' اور: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۲﴾ (الزمر) ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب برحق نازل کی ہے' لہٰذا آپؐ اللہ ہی کی بندگی کریں' دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے''۔ حق اور باطل کی آمیزش سے جو مجموعہ بھی وجود میں آئے گا وہ حق نہیں کہلائے گا' وہ حقیقت کے اعتبار سے حق نما باطل ہو سکتا ہے لیکن حق نہیں ہو سکتا' چنانچہ بقول علامہ اقبال: ؎

باطل دوئی پسند ہے' حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

اس شعر میں بڑی حکیمانہ بات بیان کی گئی ہے۔ چونکہ خالص اور مجرد باطل کا تو وجود قائم رہ ہی نہیں سکتا' لہٰذا باطل مجبور ہوتا ہے کہ وہ خود کو قائم رکھنے کے لیے حق کا کوئی نہ کوئی جزو اپنے اندر شامل کرے۔ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی ہے اور اس کا ذرہ ذرہ اُس کے حکم کا پابند ہے' لہٰذا باطل کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ باطل درحقیقت حق و باطل کا ملغوبہ ہوتا ہے اور اس میں حق کا کوئی نہ کوئی جزو شامل ہوتا ہے' جس کی تاثیر سے وہ کچھ نشوونما پاتا ہے۔ اس کی مثال آکاس بیل کی ہے جو کسی ہرے بھرے درخت ہی کے طفیل نشوونما پاتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں یہود و نصاریٰ سے سابقہ پیش آیا تو ان

دونوں فریقوں کی بھی یہ کوشش تھی کہ اگر نبی اکرم ﷺ ان کی خواہشاتِ باطلہ کی پیروی کریں اور ان کے ساتھ دین کے معاملہ میں مصالحانہ رویہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ بھی کچھ جھکنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۲۰) ''اور (اے نبی ﷺ!) یہ یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ان کے طور طریقوں کی پیروی نہ کریں''۔ مشرکین اور اہلِ کتاب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ اس ضمن میں کسی مصالحت کے لیے قطعاً آمادہ نہیں ہو سکتے' چنانچہ ان کی یہ مصالحانہ پیشکشیں دراصل مخلصانہ نہیں ہوتی تھیں' بلکہ اپنے زیر اثر عوام کو یہ مغالطہ دینے کے لیے ہوتی تھیں کہ ان کی طرف سے تو مصالحت کی کوششیں تواتر کے ساتھ جاری ہیں' مگر محمد (ﷺ) اپنے موقف پر بضد ہیں۔

ایمان بالکتاب

قرآن مجید کا یہ اعجاز ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی آیات میں نہایت اہم مضامین کا احاطہ کر لیتا ہے اور اس طرح کوزے میں سمندر بند ہونے کا محاورہ قرآن حکیم کی ہر آیت پر سو فی صد راست آتا ہے۔ چنانچہ اس آیتِ مبارکہ کے اگلے ٹکڑے میں فرمایا گیا:

﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾

''اور (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اللہ نے جو بھی کتاب نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا!''

آیتِ کریمہ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں بڑے اہم مسائل بیان کر دیے گئے ہیں' جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں' لہٰذا صرف اشارات پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ برملا ایمان بالکتاب کا اعلان فرما دیجیے۔ یہاں ''مِنْ كِتٰبٍ'' کی ترکیب خاص طور سے قابلِ غور ہے۔ اس طرح اس بات کو واضح کیا جا رہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ صرف قرآن ہی کو جو خود آپ پر نازل ہو رہا ہے' منزّل من اللہ تسلیم نہیں کرتے' بلکہ ہر آسمانی کتاب پر ایمان لانے کا اقرار فرماتے ہیں۔ آپ کا معاملہ ان لوگوں کا سا نہیں جو تفرقہ میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ تمام آسمانی کتب اور صحیفے دراصل ایک ہی کتابِ ہدایت کے مختلف ایڈیشن ہیں۔ پہلی کتابیں بھی حق تھیں' لیکن وہ

محفوظ نہ رہیں' محرف ہو گئیں۔ اب ہدایتِ ربانی کا آخری اور کامل ایڈیشن یہ قرآن مجید ہے' جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ایمان بالکتاب کے اقرار و اعلان کا حکم اس شدّ و مدّ کے ساتھ کیوں دیا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے فرمایا جا چکا ہے: ﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ﴾ ''اور آپ ان کی خواہشاتِ نفس کی پیروی نہ کیجیے!'' اُس وقت عملاً صورتِ حال یہ تھی کہ مشرکینِ مکّہ کا آپ سے ایک اہم مطالبہ یہ بھی تھا کہ آپ کو اس قرآن میں تبدیلی کرنا ہو گی یا کوئی دوسرا قرآن پیش کرنا ہو گا' کیونکہ اس قرآن کا موقف انتہائی سخت ہے اور یہ ہمارے معبودوں کی کامل نفی کرتا ہے' جنہیں ہمارے آباء و اَجداد صدیوں سے پوجتے چلے آ رہے ہیں۔ قرآن کی بات تسلیم کرنے کا صاف مطلب تو یہ ہوا کہ ہم اپنے آباء و اَجداد کو گمراہ اور کافر و مشرک تسلیم کر لیں۔ لہٰذا آپ قرآن میں تبدیلی اور لچک پیدا کیجیے یا پھر دوسرا قرآن پیش کیجیے۔ سورۂ یونس میں یہ مضمون بڑی صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۱۵﴾

''اور جب انہیں ہماری روشن اور بیّن آیات پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو (آخرت میں) ہم سے ملنے کا یقین نہیں رکھتے' کہتے ہیں کہ اس کی بجائے کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اسی میں کچھ ردّ و بدل کرو! (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ اپنی مرضی سے اس میں کوئی تغیّر و تبدّل کروں۔ میں تو خود اس کے اتباع پر مجبور ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے خود بڑے ہولناک دن کے عذاب کا خوف ہے۔''

یہی بات اختصار لیکن انتہائی جامعیت کے ساتھ اس آیت میں بیان فرمائی جا رہی ہے کہ: ﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾ ''اور آپ (برملا) کہہ دیجیے کہ میں تو خود یقینِ محکم رکھتا ہوں اس پر جو اللہ نے کتاب میں سے مجھ پر نازل کیا ہے۔''

اگر میں یہ باتیں اپنی طرف سے کہہ رہا ہوتا تو مجھے اس میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار بھی ہوتا۔ اگر یہ میرے اپنے نظریات ہوتے' میرا اپنا پروگرام ہوتا اور اپنا پارٹی منشور ہوتا جس کو چند

لوگوں نے مل جل کر باہمی مشاورت سے بنایا ہوتا تو مصلحت کے پیش نظر اس میں ردّ و بدل یا تنسیخ و ترمیم کا معاملہ ہوسکتا تھا۔ ہماری سیاسی پارٹیاں تو آئے دن وقتی کامیابی اور مصلحت کی خاطر اپنے بنیادی اصولوں تک میں تبدیلیاں کرتی رہتی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ علی الاعلان کہہ دیجیے کہ میں تو قرآن کا ایک شوشہ تک بدلنے کا مجاز نہیں ہوں‘ میں خود اس کا پابند ہوں جو مجھ پر وحی کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ سورۂ یونس کے ضمن میں حوالہ دیا جا چکا۔ اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا (قرآن کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصے کی تفسیر بیان کرتا ہے) کے اصول کے پیش نظر سورۂ یونس کی ایک اور آیت ملاحظہ کیجیے:

﴿وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (یونس)

’’اور یہ قرآن وہ چیز ہے ہی نہیں جو اللہ (کی ہدایت) کے بغیر گھڑ لی جائے‘ بلکہ یہ تو جو کچھ پہلے آ چکا تھا اس کی تصدیق اور ’’الکتاب‘‘ کی تفصیل ہے‘ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کائنات کے پروردگار کی طرف سے ہے۔‘‘

نظامِ عدل کا قیام

اس سے اگلے ٹکڑے میں فرمایا گیا:

﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾

’’اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان (نظام) عدل قائم کروں!‘‘

سورۂ ھود کے آغاز میں‘ جو زمانۂ نزول کے لحاظ سے مکی سورت ہے‘ یہ اصول بیان ہوا کہ:

﴿الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ﴾

’’الر۔ یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں‘ پھر ان کی تفصیل کی گئی اُس (اللہ) کی طرف سے جو بڑا دانا باخبر ہے۔‘‘

مطلب یہ ہوا کہ نزولِ قرآن کے ابتدائی یعنی مکی دَور میں چھوٹی چھوٹی آیات میں وہ بنیادی احکام اور اٹل اصول بیان فرمائے گئے جن پر دعوتِ اسلامی اٹھ رہی تھی اور جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے اساسی اور اصولی نکات کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر دعوتِ اسلامی کے تدریجی ارتقاء کے دوران مختلف مراحل میں ان ہی نکات کی شرح و تفصیل کی گئی۔ مثال کے طور

پر سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات پر‘ جو آغازِ وحی کے دَور کی آیات ہیں‘ تدبر کیجیے‘ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ﴿۳﴾﴾

’’اے لحاف اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جایئے اور (لوگوں کو اُن کے عقائد و اعمال کے انجام بد سے) خبردار کیجیے‘ اور اپنے ربّ کی کبریائی (کا اعلان) کیجیے!‘‘

ان آیات میں سے تیسری آیت ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ خاص طور سے لائقِ توجہ ہے۔ تکبیر کا لغوی مطلب کسی کو بڑا کرنا ہے۔ یعنی کسی بالاتر اقتدار کی بالادستی اور کبریائی کا اقرار‘ اعلان اور قیام اس کی ’’تکبیر‘‘ ہے۔ ’’تکبیرِ ربّ‘‘ کے حکم میں فصاحت و بلاغت اور ایجاز و اختصار کے لحاظ سے دعوتِ اسلامی کا ہدفِ مقصود مکمل طور پر موجود ہے‘ لیکن آگے چل کر اس جدوجہد کے مختلف مراحل میں حسبِ موقع اس حکم کی تفصیل و تشریح کی گئی۔ جیسے سورۃ التوبہ‘ سورۃ الفتح اور سورۃ الصّف (مدنی دَور کی سور) میں اس مفہوم و مدّعا کو اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳‘ الفتح:۲۸‘ الصف:۹)

’’وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (قرآن مجید) اور دینِ حق (نظامِ عدلِ اجتماعی) دے کر‘ تاکہ وہ اس (دین) کو تمام جنسِ دین (نظام ہائے اطاعت) پر غالب کر دے!‘‘

اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۳ میں فرمایا:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ﴾

’’اور ان (مشرکوں) سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہنے پائے اور دین (نظام اطاعت) صرف اللہ ہی کا ہو جائے!‘‘

آیتِ زیرِ درس میں یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے اجمال کے ساتھ بطورِ اصول بیان ہوئی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ سے برملا اعلان کرنے کا کہا گیا کہ آپؐ فرما دیجیے کہ:

﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾

’’اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان (نظام) عدل قائم کروں!‘‘

یعنی میں محض واعظ اور مبلغ بن کر نہیں آیا۔ اگر تم اس مغالطے میں مبتلا ہو تو حقیقتِ نفس الامری سے بہت دُور ہو۔ مجھے تو حکم ملا ہے کہ تمہارے مابین اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی قائم

کروں۔ میرا موقف تو یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب اور شریعت کے مطابق یہ نظامِ عدل قائم نہیں ہوتا میرا مشن تکمیل نہیں پاتا۔ میں شاہد بھی ہوں‘ مبشر و نذیر بھی اور داعی الی الخیر بھی ہوں‘ مذکر و واعظ‘ مربّی و مزکّی‘ معلّم و مدرّس اور رحمت و رأفت بھی ہوں‘ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس پر بھی مامور ہوں کہ میں عدل و انصاف کا نظام قائم کروں‘ لوگوں کے مابین موجود ظلم و استحصال ختم کروں اور بحیثیت رسولؐ اللہ اور اُس کے دین (نظامِ حیات) کو تمام نظام ہائے زندگی اور نظام ہائے اطاعت پر غالب کردوں۔ ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ﴾

حقیقت یہ ہے کہ جب سے ہم نے کتاب اللہ سے رہنمائی اور ہدایت طلب کرنا چھوڑ دی‘ اسے صرف حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کا ذریعہ بنا لیا اور اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر احتراماً طاقوں کی زینت بنا دیا تو ہم اس مقصد ہی کو فراموش کر بیٹھے جو نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا امتیازی مقصد اور ختمِ نبوت کا لازمی تقاضا تھا کہ نبی اکرم ﷺ بنفسِ نفیس وہ نظامِ عدلِ اجتماعی قائم فرمائیں جو ظلم و جور اور تعدّی سے پاک ہو۔ ظاہر ہے کہ اس عادلانہ نظام کا دستور اللہ تعالیٰ ہی مرحمت فرما سکتا ہے جو مالک الملک‘ احکم الحاکمین اور ربّ العالمین ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں یہ نظامِ عدل وقسط جزیرہ نمائے عرب کی حد تک قائم فرما دیا اور اپنے بعد یہ فریضہ اُمت کے سپرد فرمایا۔

نظامِ عدل کی ہمہ گیری

عادلانہ نظام اسی نظامِ حیات اور دستورِ زندگی کو کہا جا سکتا ہے جو زندگی کے محض ایک جزو سے تعلق نہ رکھتا ہو‘ بلکہ انسان کی انفرادی و اجتماعی پوری زندگی پر محیط ہو۔ یہ عدل اعتقادی و نظریاتی بھی ہوگا‘ یعنی اس کی اساس توحید ہوگی اور یہ ہر قسم کے شرک کی نجاست سے پاک ہوگا۔ یہ نظام عبد اور معبود کے مابین صحیح تعلق بھی قائم کرے گا۔ یہ بندے کو بتائے گا کہ اس کے مالک کے حقوق کیا ہیں اور اس کی ایسی تعلیم و تربیت کرے گا کہ جس کی بدولت وہ دل کی آمادگی‘ شوق و ذوق اور والہانہ محبت کے ساتھ ان حقوق کی ادائیگی کے لیے ہمہ وقت تیار بلکہ بے قرار رہے گا۔ یہ عدل معاشی میدان میں بھی ہوگا‘ جیسا کہ سورۃ الحشر میں فرمایا گیا: ﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ ۭ﴾ (آیت ۷) ’’تاکہ (مال و اسباب اور دولت) صرف تمہارے تونگروں ہی کے درمیان گردش میں نہ رہیں!‘‘ لہٰذا اس نظامِ عدل میں ایسے تمام طور طریقے

استعمال کیے جائیں گے کہ سرمایہ صرف امیروں کے اُلٹ پھیر میں نہ رہ جائے۔ اور یہ عدل معاشرتی میدان میں بھی ہوگا۔ اس نظامِ عدل میں نہ تو کسی کو نسل و نسب‘ رنگ و زبان اور وطن و مکان کی بنیاد پر کوئی امتیاز حاصل ہوگا اور نہ ہی مال و منال‘ منصب و وجاہت اور شہرت و حشمت کی بنیاد پر کوئی عز و شرف حاصل ہوگا۔ بلکہ فضیلت و امتیاز کا معیار صرف ’’تقویٰ‘‘ ہوگا‘ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ﴾ (الحجرات:۱۳) ’’یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ شرف والا وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہو‘‘۔ پس نبی اکرم ﷺ سے یہ کہلوا کر کہ ’’اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ‘‘ ان تمام امور کا احاطہ کر لیا گیا جو عدل کے مفہوم و مدعا کا لازمی تقاضا ہے۔ اسی کا نام اقامتِ دین اور اظہارِ دین ہے۔ اسی کا حکم حضرت نوح‘ حضرت ابراہیم‘ حضرت موسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اور محمد رسول اللہ ﷺ کو ’’اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ‘‘ کے الفاظ میں دیا گیا اور نبی اکرم ﷺ کی تو امتیازی شان ہی یہ مقرر ہوئی کہ وہ اس حکم کی بالفعل تکمیل فرمائیں‘ تاکہ تا قیامِ قیامت بنی نوعِ انسانی پر اللہ تعالیٰ کی حجت قائم ہو جائے!

الکتاب والمیزان

میں چاہتا ہوں کہ اس گفتگو کے اختتام سے قبل اس موقع پر آپ کے سامنے اسی سورۃ الشوریٰ کی سترہویں آیت اور سورۃ الحدید کی پچیسویں آیت کا حوالہ بھی پیش کر دیا جائے‘ جو درحقیقت اسی ارشادِ ربانی کی شرح ہے کہ: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ چنانچہ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۷ کی ابتدا میں فرمایا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ﴾

’’وہ اللہ ہی ہے جس نے حق کے ساتھ الکتاب (قرآن مجید) اور المیزان (شریعت) نازل فرمائی ہے!‘‘

اور سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں فرمایا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾

’’بے شک ہم نے اپنے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ الکتاب

اور المیزان اتاری تاکہ لوگ عدل پر قائم ہو جائیں!‘‘

ان دونوں آیات کا مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے جتنے بھی رسول مبعوث فرمائے اور جتنی بھی کتابیں نازل فرمائیں ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ رسول ان کتبِ الٰہی کے ذریعے وہ ’’المیزان‘‘ نصب کر دیں جس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جس کی اساس عدل وقسط پر قائم ہو۔ عادلانہ نظام کی صحیح تعبیر کے لیے ’’المیزان‘‘ (ترازو) سے بہتر اور کوئی لفظ نہیں ہوسکتا۔ اگر ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو استعمال فرماتے۔ میزان (ترازو) کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر چیز کو تولتی ہے اور اس کے صحیح وزن کو مقرر کرتی ہے۔ چنانچہ دینِ حق درحقیقت ’’المیزان‘‘ ہے جس میں ہر ایک کا حق متعین کر دیا گیا ہے۔ اللہ کا دین یہ بتاتا ہے کہ کس کا کیا حق ہے‘ کس پر کیا واجب ہے‘ فرائض کیا ہیں‘ حقوق کیا ہیں‘ اور ان کے مابین توازن کس قدر ضروری ہے اور ان کی بالفعل ادائیگی کس طرح سے ہونی ہے۔

اس ’’المیزان‘‘ کے قیام اور اس کو بروئے کار لانے کے لیے قوتِ نافذہ ضروری ہے‘ اور اس قوتِ نافذہ (حکومت) کو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے تابع کر دینا ہی اقامتِ دین واظہارِ دین ہے۔ جب تک یہ فرض انجام نہ دیا جائے یا انجام دینے کی سعی و جہد میں اپنے جسم و جان کی توانائیاں نہ لگائی جائیں اور اپنا مال نہ کھپایا جائے‘ ایمان باللہ‘ ایمان بالرسل اور ایمان بالآخرت کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ دین کے حصے بخرے کر دینے اور نظامِ سیاست وحکومت کو دین سے علیحدہ کر کے محض وعظ ونصیحت اور عبادات ونوافل کے فضائل بیان کر دینے سے دین کا منشاء پورا نہیں ہوتا۔

خاتمۂ کلام

آگے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ﴾

’’(اے نبی ﷺ! کہہ دو) اللہ ہی ہمارا ربّ ہے اور وہ تمہارا ربّ بھی ہے!‘‘

﴿لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ﴾

’’ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔‘‘

یعنی میرے اور تمہارے درمیان ایک نزاع اس طرح ختم ہوتا ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں

وہ دین سمجھ کر اور حق سمجھ کر پیش کر رہا ہوں‘ میں جو کچھ کر رہا ہوں اسے اپنا فرض سمجھ کر کر رہا ہوں اور اس کی جزاء میں اپنے ربّ سے پاؤں گا۔ تم جو کچھ کر رہے ہو اس کے بارے میں خود غور کرو‘ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو‘ اگر یہ نفس پرستی ہے‘ بددیانتی ہے تو اس کی جوابدہی تم کو کرنا ہوگی۔

﴿لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ﴾

’’ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی حجت بازی نہیں ہے۔‘‘

بحث وتمحیص اور مناظرے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

﴿اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝۱۵﴾

اللہ تعالیٰ ہی ہم سب کو جمع کرے گا۔ ایک دن آئے گا جس دن تمام معاملات طے ہو جائیں گے اور آخر کار اُسی کی طرف ہم سب کو لوٹ جانا ہے۔ سارے معاملات وہاں فیصل ہوں گے کہ کس کی کیا ذمہ داری تھی اور اس نے بالفعل کیا کیا۔ کس کا کیا موقف تھا۔ وہاں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔

آخر میں میں چاہتا ہوں کہ ’’اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ‘‘ کے حکم کو آپ ان اصطلاحات کے ساتھ اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیں جو اس سلسلۂ تقاریر میں بیان کی گئیں۔ دین کا بنیادی اور اساسی تقاضا اور اس کی پہلی منزل ’’عبادتِ ربّ‘‘ ہے‘ جس کا لازمی تقاضا ’’فریضہ شہادت علی الناس‘‘ کی ادائیگی ہے‘ جو دین کی عمارت کی دوسری اور بلند تر منزل ہے‘ جبکہ اس کا حتمی اور تکمیلی تقاضا اور بلند ترین منزل ’’اقامتِ دین‘‘ ہے!!

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین O

اقول قولی ھذا و استغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات O

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت ولزوم اور مراحل ومدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

فریضۂ اقامتِ دین:
اَسلاف کی آراء وتعامل

عبدالسلام عمر

ہمارے بعض علمی حلقوں میں ایک مغالطہ پایا جاتا ہے کہ ''غلبہ واقامتِ دین'' دورِ حاضر کے بعض جدید مفکّرین کی اختراع ہے اور یہ فکر عالمِ اسلام پر یورپی اقوام کی یورش اور غلبہ کے بعد ردِّعمل کے طور پر پروان چڑھا اور انیسویں صدی میں مسلم دنیا کے عالمی سیاسی زوال کے بعد یہ ''رومانوی'' یا بالفاظ دیگر اسلامی انقلابی فکر پیدا ہوا' جب کہ یہ تصور ہمارے اسلاف میں نہیں پایا جاتا' چنانچہ اپنے اصل کے اعتبار سے یہ ایک بدعت اور جدّت ہے اور راہِ سلف سے انحراف ہے۔

تنظیم اسلامی حلقہ بلوچستان کے ناظم تربیت اور شعبہ علوم اسلامیہ بلوچستان یونیورسٹی کے لیکچرر جناب عبدالسلام عمر نے اس علمی وتحقیقی مقالے میں اس مغالطے کا اسلاف کی آراء کی روشنی میں رد کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ یہ کوئی بدعی تصور نہیں بلکہ اسلاف کے ہاں یہ تصور زیادہ گاڑھے (concentraled) انداز میں پایا جاتا ہے۔

''دعوتِ فکرِ اسلامی مہم'' کے تحت موصوف کے مقالے کی پہلی قسط پیش خدمت ہے۔

یہ مضمون پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ: بنیادی مقدمات اور ان کی توضیح۔ دوسرا حصہ: غلبۂ اسلام کے حوالے سے اکابر مفسّرین کے اقوال (۱۰ اقوال)۔ تیسرا حصہ: اقامتِ دین کا مفہوم' تراجم' متقدمین ومتاخرین کے تفسیری اقوال (۱۶ اقوال)' اقامتِ دین اور ہم معنی اصطلاحات' ہم مضمون آیات' اقامتِ دین سے متعلق احادیثِ مبارکہ۔ چوتھا حصہ: فرضیتِ اقامتِ دین اور اسلاف کی آراء۔ پانچواں حصہ: اقامتِ دین اور اسلاف کا تعامل (بدءالاسلام سے آج تک)۔

زیرِنظر مضمون کا انداز بیانیہ ہے' تقابلی وتجزیاتی نہیں ہے۔ اس میں کسی بھی تحریک کی

کامیابی وناکامی کے اسباب وعلل کا جائزہ نہیں پیش کیا' بلکہ یہ بات ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ الحمدللہ اقامتِ دین کے کام سے اُمت کا کوئی حصہ اور دور خالی نہیں رہا اور سلف سے خلف تک اس سعی کی اہمیت بنیادی رہی ہے۔

ابتدائیہ

اسلام کی حقیقی تعبیر یقیناً خیرون القرون ہیں' اور یہ ایک غیر متنازعہ حقیقت ہے کہ اسلام ابتداء سے ہی غالب رہا اور اسے علمی وعملی اعتبار سے غلبہ حاصل رہا۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ اسلام کی صحیح اور کامل وجامع تصویر تھی۔ اگرچہ اس کے بعد شورائی نظام میں تبدیلی آئی' مگر ''بادشاہت'' کو اختیار کرنے کے بعد بھی لگ بھگ ۱۲۰۰ سال تک مسلمانوں کا عام قانون ''شریعت اسلامیہ'' پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔ یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور تنفیذِ زکوٰۃ حکومتی ذمہ داری تھی' اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر حکومت کی ذمہ داری شمار کی جاتی تھی اور حکومت اس کا بندوبست بھی کرتی تھی۔ اگرچہ علماء اپنی ذمہ داری انفرادی سطح پر ایسے نبھاتے تھے کہ ایک طرف عوام کو اور دوسری طرف بادشاہانِ وقت کو شریعت کے اوامر ونواہی کا احساس دلاتے رہتے تھے۔ عدالتوں میں قاضی قانونِ شریعت کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ معاشرتی سطح پر مرد وزن میں اختلاط نہ تھا' پردہ کا نظام عام تھا' سود' جوا' شراب' لاٹری اور دیگر حرام صورتیں اسلامی معیشت میں ممنوع تھیں۔

اسی طرح اگرچہ خلافت کی حقیقی اور تصوراتی صورت کی جگہ ''بادشاہت'' نے لے لی تھی اور یقیناً بادشاہ شریعتِ مطہرہ کے معاملے میں پہلوتہی بھی کرتے تھے اور اپنی ذات اور خاندان کے حوالے سے تجاوز بھی کرتے تھے' مگر یہ حقیقت ہے کہ انہیں بھی کبھی حاکم حقیقی ہونے کا دعویٰ کرنے کا حوصلہ نہ ہوا' بلکہ انہوں نے بھی خلافت کا لاحقہ اپنے ساتھ لگائے رکھا اور ''اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ'' کا سہارا لیے رہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جابر سے جابر اور فاسق سے فاسق بادشاہ کو مکمل طور پر شریعت کو منسوخ کر کے غیر شرعی قوانین کو ''قانونِ عام'' کا درجہ دینے کا یارانہ ہوا۔ (واضح رہے کہ کمزوریاں اور شریعت سے پہلوتہی کے حوالے سے ہم بادشاہت یا بادشاہوں کی وکالت نہیں کر رہے اور ہماری نظر میں بھی اسلام کی اصل تصویر وہی ہے جو خلافت راشدہ میں تھی جو حقیقتاً نبوت کا تتمہ تھی۔) تا آنکہ اغیار غالب آ گئے اور اسلامی حکومت کا مکمل

خاتمہ کرنے کے ساتھ ساتھ شریعتِ اسلامی کو مکمل طور پر منسوخ کر دیا گیا اور سوائے چند ذاتی عبادات و معاملات کے اجتماعی معاملات سے شریعت کو مکمل طور پر دیس نکالا دے دیا گیا۔

پھر جب اسلامی دنیا کو اسلامی ممالک میں تقسیم کر دیا گیا اور مسلمانوں پر مسلمان حکمران مسلّط کیے گئے‘ مزید یہ کہ انفرادی سطح پر کچھ مذہبی آزادی بھی دے دی گئی تو وہاں بھی شریعت کے اجتماعی احکام تقریباً منسوخ ہی رہے۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ خیرون القرون سے لے کر تقریباً چھ سو سال تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر مسلمانوں کو سیاسی و علمی عروج حاصل رہا‘ جب کہ ساتویں صدی ہجری کے دوران منگولوں کے ہاتھوں پہلے تو وسط ایشیا کی مسلمان ریاستیں تباہ و برباد ہوئیں اور اس کے بعد خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ اور دارالحکومت بغداد کی مکمل تباہی عمل میں آئی۔ اس کے چند صدیوں بعد مسلمانوں کو نویں صدی ہجری میں ہسپانیہ میں سخت ہزیمتیں اُٹھانی پڑیں اور مغربی یورپ میں مسلمانوں کی عظمتوں کے مینارز مین بوس ہوتے گئے‘ تاہم باقی دنیا میں مسلمانوں کی سیاسی اور تہذیبی قوت قائم رہی اور اس کے باوجود کہ تمام اسلامی ممالک میں حکومتیں بادشاہت کے اصول پر قائم رہیں‘ اجتماعی طور پر مسلمانوں کو ہی غلبہ حاصل رہا۔ گیارہویں صدی ہجری (۱۷ صدی عیسوی) کے اواخر میں مسلمان ممالک میں تین بڑی حکومتیں قائم تھیں: (۱) ترکی کی مسلمان حکومت‘ (۲) ایران کی مسلمان حکومت‘ اور (۳) ہند کی مسلمان حکومت۔

ترکی میں خلافتِ عثمانی قائم تھی‘ جو کسی زمانے میں حربی اعتبار سے اتنی مضبوط اور سیاسی لحاظ سے ایسی مستحکم تھی کہ یورپ کی بڑی بڑی حکومتیں اس سے خائف رہتی تھیں۔ اسی طرح ایشیاء کے وسط میں ایران کی عظیم الشان سلطنت تھی جس کا پھیلاؤ مشرق کی جانب نسبتاً زیادہ تھا‘ تاہم آذربائیجان‘ جارجیا‘ آرمینیا کا کچھ حصہ اور قفقاز کے علاقے ایران کی سلطنت میں شامل تھے۔ ہندوستان میں مغلوں کی حکومت قائم تھی‘ اورنگزیب عالمگیر کے زمانے تک اس حکومت کی حدود جنوب میں راس کماری‘ مشرق میں مانڈلے اور پگو تک اور شمال مغرب میں افغانستان اور وسط ایشیاء کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔

بارہویں صدی ہجری (۱۸ویں صدی عیسوی) کے آغاز میں ان تینوں سلطنتوں کا زوال تقریباً ایک ہی زمانے میں شروع ہوا اور مسلمانوں کے لیے زوال کا پیغام لانے والی یورپی

قومیں تھیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی اقوام کے پوری دنیا پر سیاسی غلبے نے یہ صورت پوری اسلامی دنیا میں پیدا کر دی کہ شریعتِ اسلامیہ کو مکمل طور پر منسوخ کر دیا گیا اور عالمِ اسلام مکمل طور پر مغربی تسلط کے زیر نگیں آ گیا۔ واضح رہے کہ مغرب کا یہ تسلّط صرف عسکری نہیں تھا‘ بلکہ فکر و نظر‘ تہذیب و تمدن‘ تعلیم و تعلّم اور نظام ہائے زندگی کو بھی محیط تھا‘ اور حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ مغربی تعلیم کی وجہ سے جہاں الحاد و مادیت کی ہوائیں چلیں اور مغربی تعلیمی اداروں سے تعلیم پانے والوں کی اکثریت دہریت و مادہ پرستانہ سوچ کی حامل بننے کے ساتھ ساتھ نظامِ زندگی کے طور پر ''سیکولر جمہوریت'' پر مطمئن ہوگئی اور اسے ہی انسانیت کی معراج سمجھنے لگی‘ وہیں دین دار طبقہ کی ایک بڑی تعداد اسلام کو نظامِ زندگی کے طور پر قائم کرنے کے حوالے سے اس غلط فہمی کا شکار ہوگئی کہ بہرحال حکمران چاہے نام کے سہی‘ مسلمان تو ہیں اور ہمیں صوم و صلوٰۃ اور رسوم رواج کی آزادی تو ہے۔ رہی اسلامی معاشرت‘ پردہ‘ مخلوط طرزِ زندگی کی نفی‘ عدم مساوات‘ سودی معیشت‘ جوا‘ لاٹری‘ استحصال‘ عدالتوں میں قرآن و سنت کا قانون نہ ہونا‘ غیر اسلامی قوانین‘ تو اس سے ہمیں کیا سروکار؟ یہ تو ''سیاسی امور'' ہیں اور دین و سیاست کا کیا میل؟ اور اگر ہے بھی تو عوام کا اس سے کیا لینا دینا‘ علماء جانیں اور یہ کام جانے۔ مزید یہ کہ جن میں نفاذِ شریعت کا جذبہ تھا انہیں بھی انتخابات کی بھول بھلیوں میں لگا دیا گیا‘ جہاں نہ اکثریت حاصل ہوگی نہ شریعت قائم ہوگی کا معاملہ ہے‘ اور جہاں عوام الناس میں ''ایمانِ حقیقی'' ہونا فرض کر لیا جاتا ہے اور ''ایمان کی محنت'' سے زیادہ اسلامی حکومت کے خواب سجانے کا معاملہ ہوتا ہے۔

پھر یہ کہ اس طرزِ فکر سے عوام الناس کی اکثریت میں ''غیر اسلامی'' نظام میں زندگی گزارنا نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہ رہا‘ بلکہ غلبۂ دین کی جدّوجُہد زیادہ سے زیادہ ایک اضافی نیکی قرار پائی۔ اللہ‘ اللہ! کوئی فرق سا فرق ہے کہ کہاں اسلاف کے ہاں ''استخفافِ شریعت'' گناہ شمار کیا جاتا تھا اور کہاں ''استہزاءِ شریعت'' کو بھی بارِ خاطر میں نہیں لایا جا رہا۔ اور بازاروں‘ ٹی وی چینلز اور سوشل میڈیا میں ہونے والی بے پردگی‘ سودی معیشت‘ برطانوی قانون پر مبنی نظامِ عدالت‘ جوا‘ لاٹری‘ استحصال‘ قتل و قتال‘ یہاں تک کہ ''بازی بازی باریش بابا ہم بازی!'' کے مصداق بات ناموسِ رسالت ﷺ تک آن پہنچی (کیا اس سے بھی بڑھ کر استہزاء باقی

ہے؟) مگر ''جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے'' کے مصداق عوام کی اکثریت ''دنیا کی دوڑ اور معیارِ زندگی بلند'' کرنے کی فکر میں لگی رہتی ہے' اور جن میں استعداد ہے اور جن کی ذمہ داری دوسروں سے بڑھ کر ہے وہ یہ کہہ کر کہ ''چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی'' فی الحال اس کام کے حوالے سے امن وامان کے قیام کے پیش نظر ''چلنے دو جیسے چل رہا ہے'' اور ''خواہ مخواہ کا فساد ہوگا'' اور ''ہمیں جو صوم وصلوٰۃ کی آزادی حاصل ہے وہ بھی چھن جائے گی'' اور ''پہلے کسے اس میدان میں کامیابی حاصل ہوئی ہے'' اور ''اپنے دین وایمان کی فکر کرو'' (گویا غلبہ اسلام کی جدوجہد نہ کرنے سے دین وایمان پر کوئی فرق نہیں پڑتا) ''جماعتی زندگی کی صعوبتیں اور خواہ مخواہ کی ذمہ داریاں کون نبھائے'' ایسی باتیں کر کے جان چھڑا لیتے ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ کہاں اسلام اپنے چودہ سو سالہ دور میں کسی نہ کسی صورت میں تقریباً بارہ سو سال سے اوپر غالب رہا اور کہاں یہ صورت کہ اب اسے ایک نظامِ حیات ثابت کرنا پڑ رہا ہے اور کہاں یہ کہ ''زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی'' کے مصداق اسلام غالب اور مسلمانوں کا واحد ضابطہ حیات تھا اور کہاں یہ صورت کہ اب ثابت کرنا پڑ رہا ہے کہ یہ اپنا غلبہ بھی چاہتا ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار!**

بنیادی مقدمات

اقامتِ دین کے حوالے سے بحث کا آغاز کرنے سے پہلے ہم دو بنیادی مقدمات پر گفتگو کریں گے۔

پہلا مقدمہ

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور یہ اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ یہ دو جملے ایسے ہیں جن کے بارے میں یہ تاثر یا خیال عام کیا گیا ہے کہ ''یہ فکر گزشتہ صدی میں ایک خاص نکتہ نظر کی عکاس ہے جو مجموعی طور پر قریب قریب 'بدعی تصور' ہے' کیونکہ اسلام یا دین کے لیے 'نظام' کا لفظ استعمال کرنا 'ایجادِ نو' ہے' جس کا تذکرہ ہمیں اسلاف کی کُتب میں کہیں نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے' ایسا دعویٰ بھی اغیار کی دیکھا دیکھی کیا گیا ہے جس میں بے جا کھینچ تان کر کے اسلام کو نظاموں کی بحث میں لا کھڑا کیا گیا ہے۔ اس پر مزید جلتی پر تیل کا کام

کیا ہے اس فکر نے کہ یہ اپنا غلبہ بھی چاہتا ہے اور اسلامی تحریکوں میں تشدد اور ہیجانیت کا رجحان دراصل اسی جملے کی پیداوار ہے''۔ یعنی سادہ الفاظ میں اس کے برعکس بعض لوگوں کے خیال میں اسلاف کے ہاں حقیقت کچھ یوں ہے کہ اسلام نہ ایک نظامِ زندگی ہے اور نہ یہ مکمل ضابطۂ حیات ہے اور نہ یہ اپنا غلبہ چاہتا ہے' بلکہ مغلوبیت کی حالت میں کسی بھی نظامِ زندگی کے ساتھ رہ سکتا ہے اور اس کا اصل مطمح نظر فرد کی اصلاح اور اُخروی نجات ہے' جس کا کوئی تعلق غلبۂ اسلام کی جدوجہد سے نہیں بنتا۔ فرد کے لیے اسلام کا تعبدی پہلو اور تزکیۂ نفس کی منازل طے کرنا ہی صرف ضروری ہے اور بس!

اگرچہ یہ بات اس طرح واشگاف الفاظ میں کہنا مشکل ہے' مگر تقریباً مفہوم یہی ہوتا ہے یا اس سے کم تر کچھ یہ کہ اسلام ہے تو مکمل ضابطہ حیات' لیکن یہ اپنا غلبہ نہیں چاہتا اور غلبہ والی فکر دراصل متشددانہ ہے' اور اس سے کم تر یہ کہ اسلام ہے تو مکمل ضابطہ حیات اور یہ اپنا غلبہ بھی چاہتا ہے' مگر غلبہ کی یہ جدوجہد لازم نہیں' بلکہ ایک اضافی نیکی ہے' بایں طور کہ جو کرے گا وہ ''مقامِ عزیمت'' پالے گا اور جو نہیں کرے گا' کم از کم اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی پکڑ نہیں ہوگی۔ اور اس سے بھی کم تر یہ کہ اسلام مکمل ضابطہ حیات بھی ہے اور اپنا غلبہ بھی چاہتا ہے' مگر یہ صرف علماء کے کرنے کا کام ہے' جس میں خواہ مخواہ عوام کو پابند کر دیا گیا ہے اور ان سب پر لازم کر کے اس کام کو بے جا اہمیت دی گئی ہے۔ اور اس سے بھی کم تر یہ کہ غلبہ دو قسم کا ہوتا ہے: علمی اور سیاسی۔ پس علمی غلبہ تو الحمد للہ اسلام کو ہر دور میں حاصل رہا ہے' باقی رہا سیاسی غلبہ تو اس کے ہم مکلّف نہیں ہیں' یا پھر یہ ایک خاص قیادت کے ہاتھوں ایک خاص دور میں ہوگا جس کی تیاری کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔

اس سے بھی ایک درجہ نیچے یہ کہ خلافت موعود ہے اور یہ اللہ کا نعام ہے' پس موعود کی جدوجہد کیسی اور کیونکر؟ (جنت بھی موعود ہے' تو کیا اس کی جدوجہد بھی ضروری نہیں؟) اور ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کو پورا کرنے پر ملنے والے اس انعام میں ''اعمالِ صالحہ'' کا جو تصور ہے اس میں غلبہ اسلام کی جدوجہد کوئی ''عمل صالح'' نہیں ہے۔ اور اس کے بالکل برعکس یہ کہ چونکہ گزشتہ سوا سو سال سے چلنے والی تقریباً تمام تحریکات کو اس راہ میں کامیابی نہ مل سکی' پس ایں خیال است ومحال است وجنوں۔ اور بس محض اصلاحِ فرد اور دعوتِ دین کا کام ایک خاص

ڈھنگ سے لازم ہے ـــــ ذیل میں ہم ان ابحاث کو مختصراً دیکھتے ہیں۔

(۱) تصورِ دین کی بحث

کیا اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے؟ کیا نظام حیات کا تصور نرالا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ ''نظامِ حیات'' یا ''ضابطہ حیات'' کے الفاظ اسلام کی جامعیت کو تعبیر کرنے لیے دورِ حاضر کی ضرورت ہیں اور اسلاف کے ہاں یہ الفاظ نہیں ملتے۔ گویا یہ تعبیر جدید ہے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تعبیر جدید کی بنیاد میں حقیقت واقعی کے اعتبار سے کچھ دلائل بھی ہیں یا اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کی بنیادیں نہ قرآن میں ہیں، نہ حدیث میں، نہ کتب فقہ میں اور یہ تصور ہی سرے سے نرالا وجدید ہے؟ ذیل میں ہم ان دلائل کا انتہائی اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

پہلی دلیل: قرآن مجید میں عقائد، عبادات، اخلاقیات کے ساتھ معاملات کا ذکر بھی ہے، جن میں عائلی معاملات (نکاح، طلاق، خلع وغیرہ کا ذکر بھی ہے) اور معاشرتی معاملات کا تفصیلی ذکر موجود ہے، جو سورۃ البقرۃ، النساء، المائدۃ، النور، الاحزاب، المجادلۃ، التحریم والممتحنۃ وغیرھا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ معاشی معاملات میں سود، اکلِ حلال، دَین، جوا، حرام ذرائع آمدن سے روکنا وغیرہ، سورۃ البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ اور التوبۃ وغیرھا میں بیان ہوئے ہیں۔ اور سیاست سے متعلق ہدایات، المائدۃ، یوسف، النساء، الحجرات وغیرھا میں پھیلی ہوئیں ہیں۔ (تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے!)

دوسری دلیل: احادیث مبارکہ میں قرآن مجید کی اصولی تعلیمات کی مزید شرح آ گئی ہے، چنانچہ کُتبِ احادیث میں، عقائد، احکام، رقاق، آدابِ طعام وشُرب، تفسیر وتاریخ وسیرت، قیام وقعودِ سفر، مناقب ومثالب اور اشراط وفتن جیسے مضامین ابواب کی شکل میں تفصیلاً بیان ہوئے ہیں، جن کی تفصیل حدیث کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے۔

تیسری دلیل: قرآن وحدیث کی بنیاد پر علماء نے علم فقہ مرتب کیا جس کے بنیادی مضامین میں عقائد، اخلاق اور اعمال سب کچھ شامل تھا اور جناب حضرت امام ابوحنیفہؒ سے منسوب علم فقہ کی تعریف میں اس جامعیت کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ ''**معرفة النفس ما لها وما عليها**''۔ پھر رفتہ رفتہ عقائد ''علم الکلام'' اور اخلاق ''علم تصوف'' کے عنوان سے مرتب ہوئے اور علم فقہ

''قانون'' کے معنیٰ میں رہ گیا جس میں بنیادی طور پر دو مضامین رہ گئے: ۱) عبادات، اور ۲) معاملات۔

عبادات: عبادات میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور ان سے متعلق احکامات شامل ہیں اور یہ وہ سب کچھ ہیں جن کا براہِ راست مقصد اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنا ہے۔

معاملات: معاملات سے مراد دو یا دو سے زیادہ افراد کا باہمی لین دین ہے، گویا یہ افراد کے مابین یا گروہوں کے مابین ہوتا ہے اور ان سے متعلق احکامِ شریعت کی تفصیل فقہ کے اس حصہ کا موضوع ہے۔ اس حصے کی تقسیم دو طرح سے ہوتی ہے:

(ا) فقہ کے وہ احکامات جو فرد سے متعلق ہوں، مثلاً **احوال الشخصية / فقه الاسرة** (عائلی قوانین Family Laws): یہ وہ احکامات ہیں جن کا تعلق خاندان کے تشکیل پانے اور ان کے مابین تعلقات وغیرہ سے ہوتا ہے۔ جیسے شادی بیاہ، طلاق، نسب، نان ونفقہ اور میراث وغیرہ۔ اگرچہ ان میں سے بھی بعض امور ایسے ہیں جو ریاست کے بغیر پورے نہیں ہو سکتے۔

(ب) فقہ کے وہ احکامات جن پر عمل ریاست کے بغیر ممکن نہ ہو۔ مثلاً:

(۱) **الاحوال المدنية /فقه المدنی** (دیوانی قوانین Civil Laws): یہ وہ احکامات ہیں جن کا تعلق آپس کے معاملات اور لین دین وغیرہ سے ہوتا ہے۔ جیسے خرید وفروخت، کرایہ داری، رہن، کفالت، قرض کے لین دین اور لازمی امور کی دیانت سے بجا آوری وغیرہ۔

(۲) **الاحكام الجنائية /فقه الجنائی** (فوجداری قوانین Criminal Laws): یہ وہ احکام ہیں جن کا تعلق کسی مکلّف شخص سے سرزد ہونے والے جرم سے متعلق ہوتا ہے۔ ان احکام سے مقصود لوگوں کی جان، مال، آبرو اور حقوق کی حفاظت ہوتا ہے اور امن و امان کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔ حدود وتعزیرات کا قیام بغیر ریاست کے ممکن نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آج بھی بڑے سے بڑے عالم ومفتی ریاست کے بغیر اسلام کے ان احکامات کی تعمیل کی اجازت نہیں دیتے۔

(۳) **الاحكام المرافقات/قانون ضابطه** (عدالتی کاروائیوں کے احکام Procedural Laws): فقہ میں اسے ''ادب القاضی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان احکامات کا

تعلق عدالتی فیصلے، دعوے، گواہوں، قسم، قرائن سے کسی چیز کے تعین اور اثبات سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے بغیر اسلامی ریاست کے عدالتی نظام قائم نہیں ہوسکتا اور ان امور پر عمل کہاں ممکن ہوسکتا ہے؟

(۴) **الاحکام الدستوریہ** (آئین Constitutional Laws): وہ احکام جن کا تعلق نظامِ حکومت اور اس کے اصول وضوابط سے ہے، ان سے مقصود حاکم و رعایا کے مابین تعلقات کا تعین اور افراد و جماعتوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تعین کرنا ہوتا ہے۔

(۵) **الاحکام الدولیہ** (بین الاقوامی تعلقات کے احکام International Laws): وہ احکامات جن کا تعلق اسلامی ریاست اور دیگر ریاستوں کے درمیان، امن، جنگ اور غیر مسلم شہریوں کے مسلمان ریاست کے تعلقات کے تعین سے ہوتا ہے۔ جہاد اور بین الاقوامی معاہدے اسی ذیل میں آتے ہیں۔

ہم نے ان چند شعبوں کا ذکر بطور نمونہ کے کیا ہے، وگرنہ ان میں ذیلی شعبوں کی تفصیل بہت زیادہ ہے جن کی تفصیل کا نہ موقع ومحل ہے اور نہ ہی ہمارا مقصود۔

قدیم فقہاء کے ہاں فقہ کے مندرجہ بالا شعبہ جات ومضامین کا بیان کچھ یوں ملتا ہے۔ (یہاں بھی ہم چند نمونے ذکر کریں گے!)

☆ فقہائے احناف میں علامہ ابن عابدین نے ''بحر الرائق'' کے شروع میں امورِ دین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے: اعتقادات، عبادات، معاملات، مزاجر اور آداب۔ پھر معاملات والے حصے کی مزید پانچ ابواب میں تقسیم کی ہے: معاوضاتِ مالیہ، مناکحات، مخاصمات، امانات اور ترکات، اور مزاجر۔

☆ فقہائے شافعیہ کے ہاں احکامِ شرعیہ کی تقسیم کچھ ایسے ہے کہ (۱) اگر وہ احکاماتِ شرعیہ آخرت کے متعلق ہیں تو ''عبادات'' کہلائیں گے۔ (۲) اگر وہ احکاماتِ شرعیہ امورِ دنیا سے متعلق ہیں تو ان کی تین قسمیں ہیں: (ا) اشخاص کی بقاء سے متعلق ''معاملات'' کہلاتے ہیں، (خرید وفروخت، اجارہ و رہن وغیرہ)۔ (ب) خاندان اور اس کی بقاء سے متعلق ہوں تو ''مناکحات'' کہلاتے ہیں، (نکاح وطلاق وغیرہ)۔ (ج) اور اگر پوری آبادی کی بقاء سے متعلق ہوں تو ''عقوبات'' کہلاتے ہیں، (جیسے قصاص،

سزا وتعزیرات وغیرہ)

☆ امام ابو اسحاق الشاطبیؒ نے ''الموافقات فی اصولِ الشریعۃ'' کے شروع میں مقاصدِ شریعہ کے حوالے سے دین کے وہ ضروری احکام جن پر دین و دنیا کی مصلحتوں کا انحصار ہے، کو اس طرح لکھا ہے: (۱) عبادات: جیسے نماز، روزہ وغیرہ۔ (۲) عادات: جیسے ماکولات، مشروبات، ملبوسات اور مسکونات کے احکام وغیرہ۔ (۳) معاملات: جس سے مقصود نسل ونفس اور مال کی حفاظت ہے۔ (۴) جنایات: جن سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجراء اس شخص پر ہوگا جو احکامِ بالا کو توڑے، جیسے قصاص، حدود وتعزیرات۔

مزید یہ کہ مقاصدِ شریعہ میں پانچ چیزوں کا تحفظ بہت ضروری ہے اور واقعہ یہ ہے کہ صرف ان کو سامنے رکھیں تو نظامِ اسلامی کا پورا خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ مقاصد شریعت بنیادی طور پر پانچ ہیں: (۱) تحفظِ دین (۲) تحفظِ جان (۳) تحفظِ عقل (۴) تحفظِ نسل، اور (۵) تحفظِ مال۔

پھر ان مقاصد شریعہ کی تین سطحیں علماء کرام نے بیان کی ہیں: (۱) ضروریات، (۲) حاجیات (۳) تحسینیات۔

دوسرا مقدمہ

کیا اسلام واقعتاً اپنا غلبہ چاہتا ہے؟ یا ایک مخصوص سیاسی دور میں ایک خاص سیاسی پس منظر کے تحت یہ نکتہ نظر پروان چڑھا کہ اسلام اپنا غلبہ چاہتا ہے؟ اور کیا یہ حقیقت صرف نظری و علمی غلبہ تک ہے یا اسلام سیاسی اور حکومتی سطح پر بھی اپنا غلبہ چاہتا ہے؟ پھر کیا یہ سیاسی غلبہ دورِ نبوی ﷺ تک محدود تھا (جو آنحضور ﷺ کی خصوصی ذمہ داری تھی) یا پھر حضرت مہدیؒ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے پر ہی ہوگا؟ پھر یہ کہ اُمت مسلمہ کی اسلام کے سیاسی غلبہ کے لیے جدوجہد بے اصل ہے اور یہ کہ جب خلافت موعود ہے تو اس کی جدوجہد کیسی اور کیونکر؟ یا پھر بالفاظِ دیگر اسلام کے غلبہ کی جدوجہد ایک اضافی نیکی ہے جو ہر مسلمان کے ذمہ لازم نہیں اور یہ کہ اسلام کسی بھی نظام کے ساتھ حالتِ مغلوبیت میں رہ سکتا ہے؟

ان تمام سوالات کے جوابات ہم بجائے خود دینے کے (کہ ہماری کوئی حیثیت نہیں) اَسلاف کے اقوال میں تلاش کرتے ہیں کہ اسلاف غلبہ اسلام کے حوالے سے کیا رائے رکھتے تھے:

حکومت مقصودِ اصلی نہیں ہے

سردست ایک غلط فہمی کا ازالہ بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ سب کوشش دیگر اقوام کی طرح صرف حصولِ اقتدار یا حکومت حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلاً حکومت مطلوب نہیں' بلکہ یہ غلبۂ اسلام اور احکاماتِ اسلام کی تنفیذ کے لیے ایک اہم ترین ذریعہ ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ﴿۸۰﴾﴾ (بنی اسرائیل)

''اور دعا کرو کہ پروردگار' مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال' اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے!''

یعنی یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر' یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تا کہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں' فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں' اور تیرے قانونِ عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصری اور قتادہ رحمہما اللہ نے کی ہے' اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر رحمہما اللہ جیسے جلیل القدر مفسّرین نے اختیار کیا ہے' اور اسی کی تائید حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے اس اثر سے ہوتی ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ لَيَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا يَزَعُ بِالْقُرْآنِ)) (مجموع فتاوی ابن باز) ''اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدِّباب کر دیتا ہے جن کا سدِّباب قرآن سے نہیں کرتا''۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی' بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جبکہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم ﷺ کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامتِ دین' نفاذِ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو اس صورت میں کہ جب کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔ رہا اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں' بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے۔ اگر جہاد کے لیے تلوار کا طالب ہونا گناہ نہیں ہے تو اجرائے احکامِ شریعت کے لیے سیاسی اقتدار کا طالب ہونا آخر کیسے گناہ

ہو جائے گا؟ پس معلوم ہوا کہ حکومت از خود مطلوب و مقصود کا درجہ نہیں رکھتی' بلکہ اصل مقصود غلبۂ دین ہے' جس کا ایک ذریعہ حکومت ہے۔

غلبۂ اسلام کے حوالے سے اکابر مفسّرین کے اقوال

غلبۂ اسلام کے ضمن میں اکابر مفسّرین کے اقوال نقل کیے دیتے ہیں تا کہ صورتِ مسئلہ واضح ہو جائے۔ الحمد للہ ان اقوال میں ان تمام پہلوؤں کے جوابات آ گئے ہیں اور علمی اور سیاسی غلبہ کی وضاحت بھی بخوبی آ گئی ہے۔

(۱) ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں:

لیعلی الاسلام علی الملل کلها (ابن جریر' ج ۱' سورة التوبة)

''تا کہ وہ اسلام کو تمام ادیان پر غالب کرے۔''

(۲) جار اللہ زمخشری (صاحبِ کشّاف) لکھتے ہیں:

لیظهر الدین الحق علی کل دین (کشاف' ج ۲' التوبة)

''تا کہ وہ غالب کر دے دینِ حق کو ہر دین پر۔''

(۳) قرطبیؒ نے لکھا ہے:

لیعلیه علی کل الادیان (قرطبی' الفتح)

''تا کہ وہ اس دین کو سارے ادیان پر غالب کرے۔''

سورۃ التوبہ کی آیت ۳۲ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: قولہ تعالیٰ: هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ سے مراد حضور نبی رحمت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ بِالْهُدٰی یعنی قرآن (قرآن مجید) کے ساتھ۔ وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ یعنی دلائل اور براہین کے ساتھ (تمام دینوں پر اس دین حق کو غالب کر دے)۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کے شرائع اور احکام پر غالب کر دیا یہاں تک کہ آپ پر ان میں سے کوئی شے مخفی نہ رہی۔ یہ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) وغیرہ سے مروی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے: لِیُظْهِرَهٗ یعنی تا کہ وہ دین اسلام کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ضحاک (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا: یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ہوگا۔ اور سدیؒ نے کہا ہے: یہ امام مہدی کے خروج کے وقت ہوگا' اس وقت کوئی باقی نہیں رہے گا مگر یہ کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائے گا یا

پھر جزیہ ادا کرے گا۔ (یہ سیاسی غلبہ کی طرف واضح اشارہ ہے۔)

(۴) امام شافعیؒ نے اسلام کے علمی وسیاسی غلبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

فقد اظهر الله رسوله على الاديان كلها بان ابان لكل من سمعه انه الحق اما خالفه من الاديان باطل (معالم التنزيل للبغوی' ج ٤'ص ٤٠ 'تفسير التوبة' آيت ٤١)

''اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو تمام ادیان پر غالب کر دیا ہے اور وہ اس طرح کہ اس نے اپنے ہر سننے والے پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ اسلام حق ہے اور سب ادیان باطل ہیں۔''

(۵) تفسیر دُرِّ منثور میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ لکھتے ہیں:

''اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو ناگوار ہو۔'' (سورۃ التوبۃ' آیت ۳۲)

(۶) تفسیر تیسیر القرآن میں مولانا عبدالرحمان کیلانی صاحب لکھتے ہیں:

''آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد' اسلام کی نظریاتی اور سیاسی بالادستی: اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے رسول اس لیے بھیجا ہے کہ ساری دنیا کو مسلمان بنا کے چھوڑے' بلکہ یہ مطلب ہے کہ دنیا میں جو جو دین یا نظام ہائے زندگی رائج ہیں ان سب پر بلحاظ عقل اور دلیل و حجت اسلام کی بالادستی قائم ہو جائے۔ مثلاً دورِ نبویؐ میں یہودیت ایک دین تھا۔ عیسائیت' مجوسیت' منافقت' صابئیت' مشرکین کا دین۔ ان سب ادیان کے عقائد الگ الگ تھے اور انہی عقائد کی مناسبت سے ان کا پورے کا پورا نظام زندگی ترتیب پاتا تھا۔ رسول ﷺ کی بعثت کا مقصد اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ ان تمام باطل ادیان کے نظام ہائے زندگی پر اسلام کی برتری اور بالادستی قائم کر دے۔ اور عقل اور دلیل و حجت کے لحاظ سے اسلام کی یہ برتری اور بالادستی آج تک قائم ہے۔ بیرونِ عرب ادیانِ باطل کی مثالیں: ہندو ازم' سکھ ازم' بدھ ازم' جمہوریت اور اشتراکیت وغیرہ ہیں۔ ایسے سب ادیان پر اسلام کی برتری اور بالادستی کو بہ دلائل ثابت کرنا علمائے اسلام کا فریضہ ہے۔ یہ تو نظریاتی برتری ہوئی۔ اور سیاسی برتری کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ نے اسے کئی صدیوں تک غالب رکھا۔ بعد میں جب مسلمانوں میں اخلاقی انحطاط اور انتشار رونما ہوا تو مسلمانوں سے یہ نعمت چھین لی گئی۔

اور اس کا اصول یہ ہے کہ جب تک اور جہاں تک مسلمان اپنے نظامِ زندگی اسلامی نظریات کے مطابق ڈھالیں گے اسی حد تک مسلمانوں کو غیر مسلم اقوام پر سیاسی بالادستی اور برتری

حاصل ہوگی' جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں بالقوّہ یہ استعداد موجود ہے کہ وہ سیاسی طور پر بھی تمام غیر مسلم اقوام اور نظریات پر غلبہ حاصل کرے۔ اگرچہ مسلمانوں کی عملی کوتاہیوں کی وجہ سے یہ استعداد بالفعل منظرِ عام پر نہ آ سکتی ہو۔''

(۷) مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''(چنانچہ) وہ (اللہ) ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول (ﷺ) کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین دے کر بھیجا ہے' تاکہ اس کو تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کر دے' گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔''

(۸) علامہ رشید رضاؒ لکھتے ہیں:

والاستعلاء هنا بالعلم والحجة او السيادة والغلبة او بهما وهو المختار و ان كان الوعد يصدق ببعضها و معناه انه تعالى تعلى هذا الدين ويرفع شانه على جميع الاديان بالحجة والبرهان وكذا السيادة و السلطان ولم يكن لدين من الاديان مثل هذا التاثير الروحي و العقلي والمادي والاجتماعي والسياسي الا للاسلام وحده۔ (المنار' ج ١' ص ٣٩٠۔٣٩١)

''غلبہ علم و دلیل کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے' سیادت و حکومت کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں بھی ہوتا ہے۔ اور بہتر یہ ہے کہ دونوں مراد لیے جائیں۔ اگرچہ غالب کرنے کا وعدہ ان میں سے کسی ایک کے ذریعے بھی سچا ثابت ہو جاتا ہے...... آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اس دین کو غالب کرے گا اور اس کی شان کو دوسرے سب ادیان پر بلند کرے گا' حجت و برہان کے اعتبار سے بھی اور سیادت و حکومت کے اعتبار سے بھی۔ تمام ادیان میں سے کسی بھی دین کو وہ روحانی' عقلی' مادی' تمدنی' اور سیاسی اثرات حاصل نہیں جو تنہا اسلام کو حاصل ہیں۔''

(۹) قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں:

قلت و الظاهر ان المراد بالظهور غلبة دين الحق على الاديان كلها فى اغلب الزمان ...... وقد انجز الله وعده حتّى انقاد لاهل الاسلام اهل الاديان كلها فى اكثر الاقطار واغلب الزمان ولا يقتضى هذه الآية تابيد هذه الحالة۔ (تفسير مظهری' سورة التوبة' آيت ٣٢)

''میں تو کہتا ہوں کہ ظاہر اور متبادر یہی ہے کہ ظہور سے مراد دینِ حق کا دوسرے سب ادیان پر

غلبہ اکثر اوقات کے اعتبار سے..... اللہ نے یہ وعدہ پورا کرلیا ہے کہ اکثر علاقوں اور اکثر زمانوں میں باطل ادیان کے لوگ مسلمانوں کے تابع رہے ہیں۔ اس آیت کا مقتضاء یہ نہیں کہ غلبہ کی یہ حالت ہمیشہ رہے گی۔''

(۱۰) شیخ اسماعیل حقیؒ فرماتے ہیں:

وغلبة الدين الحق على سائر الاديان تكون و على تزايد ابدا وتتم عند نزول عيسى عليه السلام (روح البیان' ج ۳' ص ۶۱۴)

''دین حق کا غلبہ باقی سب ادیان پر ہمیشہ کے لیے بڑھتا رہے گا یہاں تک کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت پورا ہو جائے گا۔''

اقامتِ دین کا مفہوم

اقامت دین کی اصطلاح دو لفظوں سے مرکب ہے: ایک ''اقامت'' دوسرا ''دین''۔

لفظ ''اقامت'' کا معنی و مفہوم

اقامت کا لفظ جب کسی ٹھوس چیز کے لیے بولا جائے تو اس وقت اس کے معنی سیدھا کر دینے کے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ﴾ (الکہف: ۷۷)

''وہاں انہوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی' (خضر نے) اس دیوار کو پھر سے قائم کر دیا۔''

اور جب یہ لفظ کسی ٹھوس چیز کے بجائے معنوی اشیاء کے لیے بولا جاتا ہے تو اس وقت اس کا مفہوم پورا پورا حق ادا کر دینے کا ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ متعلقہ کام کو پوری توجہ اور کامل اہتمام کے ساتھ بہترین شکل میں انجام دے دیا جائے' چنانچہ:

☆ امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں:

اقامة الشئ توفية حقه' وقال: **قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ**..... اى توفون حقوقها بالعلم و العمل

''کسی چیز کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حقوق اچھی طرح پورے کر دیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے پیغمبر (ﷺ) کہہ دو: اے اہلِ کتاب آپ کسی اصل پر

نہیں ہو جب تک کہ تورات اور انجیل کو قائم نہ کرلو..... یعنی جب تک علمی اور عملی حیثیتوں سے ان کے حقوق ادا نہ کر دو۔''

☆ ابو احمد بن علی الرازی الجصاصؒ (۳۶۵ھ) نے ''احکام القرآن'' میں سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کے ذیل میں اس کی لغوی تشریح یوں فرمائی ہے:

والْإِقَامَةُ فى المكان الثبات ـ وإِقَامَةُ الشيء: توفية حقّه' وقال: **قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ** (المائدة:۶۸) أى: توفّون حقوقهما بالعلم والعمل' وكذلك قوله: **وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ** (المائدة:۶۶) ولم يأمر تعالى بالصلاة حيثما أمر' ولا مدح بها حيثما مدح إلّا بلفظ الإقامة' تنبيها أنّ المقصود منها توفية شرائطها لا الإتيان بهيئاتها' نحو: **اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ** (البقرة:۴۳)' فى غير موضع **وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ** (النساء:۱۶۲) ـ وقوله: **وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى** (النساء:۱۴۲) فإنّ هذا من القيام لا من الإقامة' وأمّا قوله: **رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ** (إبراهيم:۴۰) أى: وفّقنى لتوفية شرائطها' وقوله: **فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ** (التوبة:۱۱) فقد قيل: عنى به إقامتها بالإقرار بوجوبها لا بأدائها۔

والمُقَامُ يقال للمصدر' والمكان' والزّمان' والمفعول' لكن الوارد فى القرآن هو المصدر نحو قوله: **اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا** (الفرقان:۶۶)' والمُقَامةُ: لإقامة' قال: **اَلَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ** (فاطر:۳۵) نحو: **دَارُ الْخُلْدِ** (فصلت:۲۸)' **وَجَنّٰتِ عَدْنٍ** (التوبة:۷۲) وقوله: **لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا** (الاحزاب:۱۳)' من قام' أى:لا مستقرّ لكم' وقد قرء:لا مقام لَكُم من أَقَامَ۔ ويعبّر بالإقامة عن الدوام ـ نحو: **عَذَابٌ مُّقِيْمٌ** (هود:۳۹)' وقرء: **اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ** (الدخان:۵۱)' أى: فى مكان تدوم إقامتهم فيه' وتَقْوِيمُ الشيء: تثقيفه' قال: **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ** (التين:۴)

الاقامة (افعال) فى المكان کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے اور قیام کرنے کے ہیں

اوراقامۃ الشیئ (کسی چیز کی اقامت) کے معنی اس کا پورا پورا حق ادا کرنے کے ہوتے ہیں‘ چنانچہ قرآن پاک میں ہے: قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰی شَیۡءٍ حَتّٰی تُقِیۡمُوا التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ (المآئدۃ:۶۸) ’’کہو کہ اے اہل کتاب! جب تک تم توراۃ اور انجیل کو قائم نہ رکھو گے کچھ بھی راہ پر نہیں ہو سکتے‘‘ یعنی جب تک کہ علم وعمل سے ان کے پورے حقوق ادا نہ کرو۔ اسی طرح فرمایا: وَلَوۡ اَنَّهُمۡ اَقَامُوا التَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ (المآئدۃ:۶۶) ’’اور اگر وہ توراۃ اور انجیل کو قائم رکھتے‘‘۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے یا نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے‘ وہاں اقامۃ کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے‘ جس میں اس بات پر تنبیہ کرنا ہے کہ نماز سے مقصود محض اس کی ظاہری ہیئت کا ادا کرنا ہی نہیں ہے‘ بلکہ اسے جملہ شرائط کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ اسی بنا پر کئی ایک مقام پر اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ اور اَلۡمُقِیۡمِیۡنَ الصَّلٰوۃَ کہا ہے۔

اور آیت کریمہ: وَاِذَا قَامُوۡۤا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوۡا کُسَالٰی (النساء:۱۴۲) ’’اور جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو سست اور کاہل ہو کر‘‘ میں قاموا ‘ اقامۃ سے نہیں بلکہ قیام سے مشتق ہے (جس کے معنی عزم اور ارادہ کے ہیں) اور آیت: رَبِّ اجۡعَلۡنِیۡ مُقِیۡمَ الصَّلٰوۃِ (ابراھیم:۴۰) ’’اے پروردگار مجھ کو (ایسی توفیق عنایت) کر کہ نماز پڑھتا رہوں‘‘ میں دعا ہے کہ الٰہی مجھے نماز کو پورے حقوق کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرما اور آیت کریمہ: فَاِنۡ تَابُوۡا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ (التوبۃ:۱۱) ’’پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے لگیں‘‘ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اقامۃ سے نماز کا ادا کرنا مراد نہیں ہے‘ بلکہ اس کے معنی اس کی فرضیت کا اقرار کرنے کے ہیں۔

المُقام: یہ مصدر میمی‘ ظرف مکان‘ ظرف زمان اور اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے‘ لیکن قرآن پاک میں صرف مصدر میمی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اِنَّهَا سَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّمُقَامًا (الفرقان:۶۶) ’’اور دوزخ ٹھہرنے اور رہنے کی بہت بری جگہ ہے‘‘۔ اور مُقامۃ معنی اقامۃ ہے‘ جیسے فرمایا: اَلَّذِیۡۤ اَحَلَّنَا دَارَ الۡمُقَامَةِ مِنۡ فَضۡلِهٖ (فاطر:۳۵) ’’جس نے ہم کو اپنے فضل سے ہمیشہ کے رہنے کے گھر میں اتارا‘‘۔ یہاں جنت کو دار المقامۃ کہا ہے جس طرح کہ اسے دار الخلد اور جنات عدن کہا ہے۔ اور آیت کریمہ: لَا مُقَامَ لَکُمۡ فَارۡجِعُوۡا (الأحزاب:۱۳) ’’یہاں تمہارے

لیے (ٹھہرنے کا) مقام نہیں ہے تو لوٹ چلو‘‘ میں مقام کا لفظ قیام سے ہے‘ یعنی تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اور ایک قراءت میں مَقَام (بفتح میم) اَقَامَ سے ہے اور کبھی اقامۃ سے دوام مراد لیا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا: عَذَابٌ مُّقِیۡمٌ (ھود:۳۹) ’’ہمیشہ کا عذاب‘‘۔ اور ایک قراءت میں آیت کریمہ: اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ مَقَامٍ اَمِیۡنٍ (الدخان:۵۱) ’’بیشک پرہیزگار لوگ امن کے مقام میں ہوں گے‘‘ میں مقام بضمہ میم ہے‘ یعنی ایسی جگہ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ تقویم الشیئ کے معنی کسی چیز کو سیدھا کرنے کے ہیں‘ چنانچہ فرمایا: لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ (التین:۴) ’’ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا‘‘۔ اس میں انسان کے عقل وفہم قد وقامت کی راستی اور دیگر صفات کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے اور وہ اس کے تمام عالم پر مستولی اور غالب ہونے کی دلیل بنتی ہیں۔

لفظ ’’دین‘‘ کا معنی ومفہوم

دین: (د ی ن)۔ الدین کے معنی اطاعت اور جزا کے آتے ہیں اور دین‘ ملّت کی طرح ہے‘ لیکن شریعت کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے اسے ’’دین‘‘ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۟ قف﴾ (آل عمران:۱۹) ’’دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔‘‘ (الجصاص‘ الشوریٰ‘ آیت ۱۳)

دین کا لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ مختصراً یہ چار معانی میں استعمال ہوتا ہے: (۱) اللہ کی کامل اور مکمل سیاسی اور قانونی حاکمیت‘ (۲) انسان کی مکمل عبودیت اور بندگی‘ (۳) قانونِ جزا وسزا یا تعزیراتِ ملکی‘ (۴) قانونِ جزا وسزا کے نفاذ کی قدرت۔ پھر یہ لفظ کبھی ایک معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی ایک سے زیادہ معنوں میں۔ اب دین کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو کچھ باتوں کا حکم دے‘ کچھ کاموں سے منع کرے اور جو شخص ان احکام کے مطابق عمل کرے انہیں اچھا بدلہ دے اور جو حکم عدولی کرے اسے سزا بھی دے۔ چنانچہ ایسے احکام جو سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر غیر متبدل رہے ہیں‘ یہی اصل دین ہے‘ مثلاً شرک کی حرمت‘ آخرت اور اس کا محاسبہ‘ نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم‘ قتلِ ناحق‘ چوری‘ زنا اور فواحش سے اجتناب وغیرہ۔ (تشریح وتوضیح از مولانا کیلانی تیسیر القرآن)

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کے معروف تراجم

(۱) شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) نے اقیموا الدین کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے: ''قائم کنید دین را'' (دین کو قائم کرو)۔ (فتح الرحمٰن)

(۲) شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ: ''قائم رکھو دین کو''

(۳) شیخ الہندؒ کا ترجمہ: ''قائم رکھو دین کو'' (فوائد القرآن)

(۴) مفتی تقی عثمانی صاحبؒ: ''دین کو قائم کرو'' (آسان ترجمہ قرآن)

(۵) مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ: ''قائم کرو اس دین کو'' (تفہیم القرآن)

(۶) مولانا امین احسن اصلاحیؒ: ''قائم رکھو اس دین کو'' (تدبر قرآن)

(۷) ڈاکٹر اسرار احمدؒ: ''قائم کرو دین کو'' (بیان القرآن)

(۸) پیر کرم شاہ صاحب الازہریؒ: ''قائم رکھو اس دین کو'' (ضیاء القرآن)

(۹) مولانا سرفراز خان صفدرؒ: ''قائم کرو تم دین کو'' (تفسیر ذخیرۃ الجنان)

(۱۰) مولانا عبدالرحمان کیلانیؒ: ''دین کو قائم رکھو'' (تیسیر القرآن)

(۱۱) مولانا عبدالحمید سواتیؒ: ''کہ قائم رکھو دین کو'' (معالم العرفان)

(۱۲) مولانا وحیدالدین خان صاحب: ''کہ دین کو قائم رکھو'' (تذکیر القرآن)

(۱۳) مفتی محمد شفیعؒ: ''کہ قائم رکھو دین کو'' (معارف القرآن)

(۱۴) مولانا عبدالحق حقانیؒ: ''کہ اسی دین پر قائم رہنا'' (تفسیر حقانی)

(۱۵) سید قطب شہیدؒ: ''کہ قائم کرو اس دین کو'' (ترجمہ فی ظلال القرآن)

(۱۶) مولانا اشرف علی تھانویؒ: ''اسی دین کو قائم رکھنا'' (بیان القرآن)

(۱۷) مولانا ابوالکلام آزادؒ: ''کہ دین الٰہی قائم کرو'' (ترجمان القرآن)

(۱۸) پروفیسر حافظ احمد یارؒ: ''کہ تم لوگ قائم رکھو اس نظامِ حیات کو'' (مطالعہ قرآن حکیم)

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کی تفسیر میں متقدمین ومتاخرین کے اقوال

(۱) حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اسے تاکیدی حکم دیا کہ وہ نماز قائم کرے، زکوٰۃ

دے، اللہ تعالیٰ کے لیے اطاعت کا اقرار کرے، یہی وہ دین ہے جو ان کے لیے مشروع کیا گیا، (یہی قول واسطی نے ابن عباس ؓ سے نقل کیا اور یہی قول کلبی کا بھی ہے)۔'' (بحوالہ تفسیر قرطبی، ج ۸)

۲۔امام ابن جریر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) لکھتے ہیں:

الذی اوصی به جمیع هولآء الانبیاء وصیةً واحدةً وهی اقامة الدین

''ان سب انبیاء کو اللہ نے جو وصیت کی تھی وہ ایک ہی وصیت تھی اور وہ تھی اقامتِ دین کی وصیت۔'' (ابن جریر، الشوریٰ، آیت ۱۳)

مزید فرماتے ہیں:

اعملوا به علی ما شرع لکم و فرض ولا تختلفوا فی الدین الذی امرتم بالقیام به کما اختلف الاحزاب من قبلکم (جامع البیان عن تاویل آی القرآن سورة الشوریٰ، آیت ۱۳)

''اس پر عمل کرو جیسا کہ اللہ نے یہ تمہارے لیے مقرر کیا ہے اور اسے تم پر فرض کر دیا ہے، اور اس دین میں اختلاف نہ کرو جسے قائم رکھنے کا تم کو حکم دیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلی قوموں نے اختلاف کیا۔''

۳۔ابوالحسن ماوردیؒ (م ۴۵۰ھ) اپنی تفسیر ''تفسیر الماوردی'' میں لکھتے ہیں:

اعملوا به، ادعوا الیه، جاهدو علیه من عانده

''اس دین پر عمل کرو، اس کی طرف دعوت دیتے رہو اور اس کے دشمنوں کے مقابلے میں جہاد کرو۔'' (ج ۵)

۴۔ابن عربیؒ (م ۵۴۷ھ)، قرطبیؒ (م ۶۷۱ھ)، ابو حیان اندلسیؒ (م ۷۵۴ھ)، علامہ آلوسیؒ (م ۱۲۷۰ھ) اور مراغیؒ (۱۹۵۲ء) سب نے یکساں الفاظ لکھے ہیں:

اجعلوه قائمًا یرید دائمًا مستمرًا محفوظًا مستقرًا من غیر خلاف

''اس دین کو قائم و دائم اور جاری رکھو، محفوظ رکھو، برقرار رکھو اور اس میں اختلاف نہ کرو۔''

۵۔اس بات کی مزید تفصیل و وضاحت کہ اقامت دین سے کیا مراد ہے، قاضی ابو السعودؒ (م ۹۵۱ھ)، شیخ اسماعیل حقیؒ (م ۱۱۳۷ھ) اور علامہ آلوسیؒ (م ۱۲۷۰ھ) کے ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ:

والمراد باقامته تعدیل ارکانه و حفظه من ان یقع فیه زیغ والمواظبة علیه

''اقامتِ دین سے مراد ہے اس کے ارکان واحکام کو درست طریقے پر قائم رکھنا' خرابی اور کجی سے اس کی حفاظت کرنا اور ہمیشہ کے لیے اس کی پابندی کرنا۔''

۶۔علامہ جلال الدین سیوطیؒ ''تفسیر دُرِّمنثور'' میں لکھتے ہیں:

''ابن جریرؒ نے سدیؒ سے روایت کیا کہ (آیت) ان اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کہ اس دین کو قائم رکھنا یعنی اس پر عمل کرتے رہنا۔

عبد بن حمیدؒ وابن جریرؒ وابن المنذرؒ نے قتادہؒ سے روایت کیا کہ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (کہ اس دین قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا) یعنی تم جان لو کہ افتراق ہلاکت ہے اور جماعت میں اعتماد ہے۔ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ (مشرکین کو وہ بات بڑی بھاری گزرتی ہے جس کی طرف آپ ﷺ ان کو بلا رہے ہیں)۔یعنی مشرکین تکبّر کرتے ہیں (نہیں مانتے) جو ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ابلیس اور اس کے لشکروں نے ان کو گمراہ کر دیا تا کہ ان کو جہنم میں اتار دے تو اللہ تعالیٰ نے انکار کیا مگر وہ اس کو نافذ کرے اور ان کی مدد کرے اور اس پر اسے غلبہ دے جو اس کا مقابلہ کرے۔اور یہ ایک ایسا کلمہ ہے جس نے اس کی مدد کے ساتھ جھگڑا کیا' وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے مدد طلب کی اس کے ذریعہ اس کی مدد کی گئی۔

۷۔مدارک التنزیل میں احمد بن محمود النسفیؒ فرماتے ہیں:

اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ (کہ تم اس دین کو قائم رکھنا) سے مراد اس سے دین اسلام کو قائم کرنا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی اطاعت اور ایمان برسل اللہ اور اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور یوم جزاء پر ایمان و دیگر تمام ضروریاتِ دین' جن کے قائم کرنے سے آدمی مسلمان ہوتا ہے' کا نام ہے۔اس سے مراد احکامات نہیں کیونکہ وہ مختلف ہیں۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَا جًا﴾ (المائدۃ:۴۸)

اَنْ اَقِیْمُوا محل نصب میں شَرَعَ کے مفعول اور اس کے دونوں معطوف علیہ کا بدل ہے۔ جملہ مستانفہ ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے' گویا اس طرح کہا گیا وہ مشروع کیا ہے؟ تو جواب دیا وہ اقامتِ دین ہے۔

وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا) دین میں اختلاف نہ کرنا۔قول علی رضی اللہ عنہ ہے کہ تفرقہ مت ڈالو۔جماعت رحمت ہے اور تفرقہ عذاب ہے۔''

۸۔مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی تفسیر ''بیان القرآن'' میں فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح (علیہ السلام) کو حکم دیا تھا

اور جس کو ہم نے آپ (ﷺ) کے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) (مع ان سب کے اتباع کے) حکم دیا تھا (اور ان کی امم کو یہ کہا تھا کہ) اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔مشرکین کو وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ (ﷺ) ان کو بلا رہے ہیں۔اللہ اپنی طرف جس کو چاہے کھینچ لیتا ہے اور جو شخص (خدا کی طرف) رجوع کرے اس کو اپنے تک رسائی دے دیتا ہے۔''

فائدے میں لکھتے ہیں:

''مراد اس دین سے اصولِ دین ہیں جو مشترک ہیں تمام شرائع میں مثل توحید و رسالت و بعث وغیرہ۔''

''قائم رکھنا یہ کہ اس کو تبدیل مت کرنا' اس کو ترک مت کرنا' اور تفرق یہ کہ کسی پر ایمان نہ لاویں' یا کوئی ایمان لاوے کوئی نہ لاوے' حاصل یہ کہ توحید وغیرہ دین قدیم ہی کے اول سے اس وقت تک تمام شرائع اس میں متفق رہی ہیں اور اس کے ضمن میں نبوت کی بھی تائید ہو گئی' پس چاہیے تھا کہ اس کو قبول کرنے میں لوگوں کو ذرا پس وپیش نہ ہوتا۔''

۹۔مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ''فوائد القرآن'' میں رقمطراز ہیں:

''یعنی سب انبیاءؑ اور ان کی امتوں کو حکم ہوا کہ دین الٰہی کو اپنے قول وعمل سے قائم رکھیں اور اصل دین میں کسی طرح کی تفریق واختلاف کو روا نہ رکھیں۔''

۱۰۔معارف القرآن میں مفتی محمد شفیعؒ فرماتے ہیں:

''اقامتِ دین فرض اور اس میں تفرق حرام ہے: اس آیت میں دو حکم مذکور ہیں' ایک اقامتِ دین اور دوسرا اس کا منفی پہلو یعنی اس میں تفرق کی ممانعت۔جبکہ جمہور مفسّرین کے نزدیک اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ میں حرف اَنْ تفسیر کے لیے ہے تو دین کے معنی متعین ہو گئے کہ اس سے مراد وہی دین ہے جو سب انبیاء علیہم السلام میں مشترک چلا آ رہا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ دین مشترک بین الانبیاء اصولِ عقائد یعنی توحید' رسالت' آخرت پر ایمان اور اصولِ عبادات' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ کی پابندی ہے۔نیز چوری' ڈاکہ' زنا' جھوٹ فریب' دوسروں کو بلاوجہ شرعی ایذاء دینے وغیرہ اور عہد شکنی کی حرمت ہے جو سب ادیانِ سماویہ میں مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں۔اور یہ بھی نص قرآن سے ثابت ہے کہ فروعی احکام میں انبیاء کی شریعتوں میں جزوی اختلاف بھی ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَا جًا۔اس مجموعہ سے ثابت ہوا کہ آیت کے اس جملہ میں جس دین کی اقامت کا حکم اور اس میں تفرق کی ممانعت مذکور ہے' وہ وہی احکامِ الٰہیہ ہیں جو سب انبیاء علیہم السلام کی شرائع میں

مشترک اور متفق علیہ چلے آئے ہیں۔ انہی میں تفرق واختلاف حرام اور موجبِ ہلاکتِ اُمم ہے۔

اس ضمن میں ایک حدیث ملاحظہ ہو:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ نے ہمارے سامنے ایک سیدھا خط کھینچا۔ پھر اس خط کے دائیں اور بائیں دوسرے چھوٹے خط کھینچے اور فرمایا کہ یہ دائیں اور بائیں کے خطوط وہ طریقے ہیں جو شیاطین نے ایجاد کیے ہیں اور اس کے ہر راستہ پر ایک شیطان مسلط ہے جو لوگوں کو اس طرف چلنے کی تلقین کرتا ہے اور پھر سیدھے خط کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ((وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ)) ''یہ میرا سیدھا راستہ ہے تو اسی کا اتباع کرو'' (رواہ احمد والنسائی والدارمی ومظہری)

اس تمثیل میں صراطِ مستقیم وہی دین قیم کا راستہ ہے جو سب انبیاء علیہم السلام میں مشترک چلا آیا ہے۔ اس کے اندر شاخیں نکالنا یہ تفرق حرام اور شیاطین کا عمل ہے اور انہی اجماعی اور متفق علیہ احکام میں تفرقہ ڈالنے کی شدید ممانعت احادیث صحیحہ میں آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه)) (رواہ احمد وابو داؤد) ''جس شخص نے جماعت مسلمین سے ایک بالشت بھی جدائی اختیار کی، اس نے اسلام کا حلقہ عقیدت اپنے گلے سے نکال دیا''۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ((يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ)) (رواہ الترمذی بسند حسن) یعنی اللہ کا ہاتھ ہے جماعت پر۔ اسی طرح حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شیطان انسانوں کے لیے بھیڑیا ہے جیسے بکریوں کے گلہ کے پیچھے بھیڑیا لگتا ہے، تو وہ اسی بکری کو پکڑتا ہے جو اپنی ڈار اور گلہ سے پیچھے یا اِدھر اُدھر رہ جائے۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ جماعت کے ساتھ رہو اور علیحدہ نہ ہو'' (رواہ احمد۔ یہ سب احادیث تفسیرِ مظہری میں ہیں)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس آیت میں حکم اس دین مشترک اور متفق علیہ کے قائم رکھنے کا ہے، جس پر تمام انبیاء علیہم السلام متفق اور مشترک چلے آئے ہیں۔ اس میں اختلاف کو تفرق کے لفظ سے تعبیر کر کے ممنوع کیا گیا ہے۔ انہی قطعی احکام میں اختلاف وتفرق کو احادیث مذکورہ میں ایمان کے لیے خطرہ اور سبب ہلاکت فرمایا ہے۔

ائمہ مجتہدین کے فروعی اختلافات تفرق ممنوع میں داخل نہیں: اس سے واضح ہو گیا کہ فروعی مسائل میں جہاں قرآن وحدیث میں کوئی واضح حکم موجود نہیں یا نصوصِ قرآن وسنت میں کوئی ظاہری تعارض ہے، وہاں ائمہ مجتہدین کا اپنے اپنے اجتہاد سے کوئی حکم متعین کر لینا،

جس میں باہم اختلاف ہونا اختلافِ رائے ونظر کی بنا پر لازمی ہے، اس تفرق ممنوع سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ایسا اختلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں خود عہد رسالت سے چلا آیا ہے اور وہ باتفاقِ فقہاء رحمت ہے۔ اور اقامت دین سے مراد اس پر قائم دائم رہنا، اس میں کسی شک وشبہ کو راہ نہ دینا، اور کسی حال اس کو نہ چھوڑنا ہے۔ (قرطبی)''

۱۱۔ ترجمان القرآن میں مولانا ابوالکلام آزادؒ فرماتے ہیں:

''آیت ۱۳ میں پانچ اولوالعزم پیغمبروں (علیہم السلام) کا نام لے کر بتا دیا کہ سب کو ایک ہی دین دے کر بھیجا گیا تھا۔ یہ دین محض چند اصول وعقائد ہی کا نام نہیں، بلکہ اس میں شرائع کے بنیادی احکام بھی داخل ہیں، جیسا کہ سورۃ البینہ میں فرمایا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ۝﴾ یعنی انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے یکسو ہو کر اس کی عبادت کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اسی طرح محرمات شرعیہ کو تکمیل دین قرار دیا ہے (المائدہ ۳) اور پھر سورۃ التوبہ کی آیت ۲۹ میں اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ حلال وحرام کے احکام کو ماننا بھی دین میں داخل ہے اور سورۃ النور میں حدودِ الٰہیہ کے قیام کو دین قرار دیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فوج داری احکام بھی دین میں داخل ہیں۔

الغرض یہ 'الدین' کا اجمالی خاکہ ہے جس کی طرف دعوت دینے اور اسے قائم کرنے کے لیے پیغمبر بھیجے گئے۔ نبی ﷺ بھی اسی دین کی طرف دعوت دینے کے لیے مبعوث ہوئے۔ یہ دعوت مشرکین پر گراں گزرتی، اس بنا پر کبھی تو وہ نبی ﷺ کی نبوت پر اعتراض کرتے اور کبھی مصالحت کا اظہار کر کے کچھ نرمی اختیار کرنے کو کہتے مگر نبی ﷺ استقامت کے ساتھ ان مخالفانہ حربوں کو برداشت کرتے رہے اور دین کے معاملہ میں کسی قسم کی رواداری اور مداہنت سے کام نہ لیا۔''

۱۲۔ ضیاء القرآن میں حضرت پیر کرم شاہ صاحب الازہریؒ لکھتے ہیں:

''پہلے اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان اور عظمت وکبریائی کا بیان ہوا۔ اب اس دین قیم کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم صادر فرمایا جا رہا ہے جس کی تأسیس اور تکمیل کے لیے سارے اولوالعزم رسول علیہم السلام مصروفِ جہاد رہے۔ شرع کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ شَرَعَ سَنَّ: کوئی طریقہ مقرر کرنا۔ شَرَعَ: اَظْهَرَ، اَوْضَحَ وَبَيَّنَ۔ کسی مخفی چیز کو ظاہر کرنا۔ اس کو یوں عیاں اور آشکارا کرنا کہ شک وشبہ کی کوئی گنجائش تک باقی نہ رہے۔

ارشاد ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ جس کی جلالتِ شان کے تذکرے ہو رہے ہیں‘ اسی نے اس دین کو تم پر واضح اور بین کر دیا‘ جس کا حکم اس نے رسولِ اول حضرت نوح علیہ السلام کو دیا تھا اور جس پر آپ کو اے خاتم الانبیاء ﷺ بذریعہ وحی آگاہی بخشی ہے‘ اور یہی وہ دین ہے جس کے بارے میں حضرت ابراہیم‘ موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو وصیت فرمائی گئی تھی۔ سپہر رسالت کے یہی وہ رخشندہ و تابندہ مہر و ماہ ہیں جنہیں اولوالعزم رسول کے جلیل لقب سے نوازا گیا ہے۔ فرمایا پہلے اور آخری رسول اور مختلف دہور و شہور میں تشریف لانے والے یہ جلیل القدر رسول ایک ہی دین اور ایک ہی نظامِ حیات کے داعی اور مبلغ تھے۔ صرف داعی اور مبلغ ہی نہیں‘ بلکہ اس کے مؤسس اور اس کو پروان چڑھانے والے بھی تھے۔ انبیائے کرام علیہم السلام نے ایک دوسرے کی تکذیب نہیں کی اور اپنے اپنے دور میں علیحدہ ادیان قبول کرنے کے لیے نہیں کہا‘ بلکہ ایک اور صرف ایک دین کے لیے کوشاں رہے۔

آیت کے اس حصے کا پہلے حصے سے کیا تعلق ہے‘ اس کے متعلق دو قول ہیں: یا تو یہ شَرَعَ کے مفعول کا بدل ہے۔ اس صورت میں یہ حکماً منسوخ ہوگا یا یہ مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ کلام کے پہلے حصے کو سننے کے بعد یہ سوال دل میں کھٹکنے لگتا تھا کہ وہ کیا ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے ان اولوالعزم رسولوں کو دیا تھا۔ فرمایا: **هُو اقامة الدين تو اَنْ اَقِيْمُوْا** خبر ہے اور **هُوَ** محذوف مبتدا۔ اس سے یہ امر واضح ہو گیا کہ تمام انبیاء کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ اس دین کو قائم کرو‘ لوگوں کی عملی زندگیوں میں اسے رائج کرو‘ تاکہ لوگوں کے اعمال اسی دین کے قالب میں ڈھل جائیں۔ صرف زبانی دعوت دینا اور اس دعوت کے محاسن کو بیان کرتے رہنا ہی انبیاء کا فریضہ نہ تھا‘ بلکہ ان کی ذمہ داری یہ تھی کہ جہاں یہ نظامِ حیات رائج نہیں وہاں اسے رائج کیا جائے اور جہاں یہ رائج ہے وہاں یہ اہتمام کیا جائے کہ یہ رواج پذیر رہے۔ ایسے عوامل اور محرکات سے اس کی پوری پوری حفاظت کی جائے جو اس کو عملی زندگی سے بے دخل کرنے پر منتج ہوں۔

یہ نصب العین جو انبیا و رسل علیہم السلام کی عظیم البرکات زندگیوں کا نصب العین تھا‘ یہی نصب العین آج اُمتِ محمد یہ علیٰ صاحبہا افضل الصلوات واجمل التسلیمات کے لیے من جانب اللہ مقرر کیا گیا ہے اور انہیں یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے آراء واہوا کا اتباع کر کے اپنی جمعیت کو انتشار کا شکار نہ بنا دیں اور ایک امت کو متعدد فرقوں میں بانٹ کر بے وقار نہ کر دیں‘ کیونکہ اگر انہوں نے اپنی وحدت اور یکجہتی کو فرقہ بازی کی نذر کر دیا تو پھر اقامت دین کے فریضہ سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے۔ ان کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا‘ ان کی ہوا اُکھڑ جائے گی۔

نئے انسانی معاشروں میں اس کو قائم کرنا تو بڑی بات ہے‘ جہاں ان کے اسلاف کی کوششوں کے باعث دین قائم ہو چکا ہے وہاں اس کا باقی رہنا بھی مشکوک ہو جائے گا اور اس کا مشاہدہ ہم اپنے ہاں کر رہے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر متحد و متفق رہنے کی ہدایات دی گئی ہیں اور حضور سرورِ عالم ﷺ نے بار بار اپنے ارشاداتِ عالیہ‘ حکیمانہ میں ہمیں بے اتفاقی سے ڈرایا ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے **قال قال رسول اللّٰه ﷺ ((من فارق الجماعة شبرا فقد خلع ربقة الاسلام من عنقه))** ''جس نے دانستہ ایک بالشت بھر کے لیے بھی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اس نے گویا اپنے گلے سے اسلام کا رشتہ اتار پھینکا''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: **قال رسول اللّٰه ﷺ ((يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَة))** ''اللہ تعالیٰ کی نصرت اور رحمت کا ہاتھ جماعت پر ہے''۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ایک بڑی پیاری حدیث منقول ہے: **قال رسول اللّٰه ﷺ ((ان الشيطان ذئب الانسان كذئب الغنم يا خذ الشاذة والقاصية والناحية واياكم والشعاب وعليكم بالجماعة والعامة))** (رواہ احمد) یعنی حضور ﷺ نے فرمایا: ''جس طرح بکریوں کے لیے بھیڑیا ہوتا ہے اسی طرح شیطان‘ انسان کے لیے بھیڑیا ہوتا ہے۔ بھیڑیا اپنے ریوڑ سے الگ ہو جانے والی یا دور آگے چلی جانے والی یا ایک طرف ہو جانے والی کو ہی پکڑتا ہے اور میں تمہیں اس بات سے ڈراتا ہوں کہ تم گروہ گروہ ہو جاؤ۔ تم پر لازم ہے کہ تم جماعت کے ساتھ اور عام لوگوں کے ساتھ رہو۔'' (مظہری)''

۱۳۔ مولانا مودودیؒ تفسیر تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

''اس کے بعد فرمایا کہ ان سب انبیاء کو دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع اس ہدایت اور تاکید کے ساتھ دی گئی تھی کہ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ۔ اس فقرے کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ''قائم کنید دین را'' کیا ہے‘ اور شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے ''قائم رکھو دین کو''۔ یہ دونوں ترجمے درست ہیں۔ اقامت کے معنی قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی‘ اور انبیاء علیہم السلام ان دونوں ہی کاموں پر مامور تھے۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم کریں۔ اور دوسرا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو وہاں اسے قائم رکھیں۔ ظاہر بات ہے کہ قائم رکھنے کی نوبت آتی ہی اس وقت ہے جب ایک چیز قائم ہو چکی ہو‘ ورنہ پہلے اسے قائم کرنا ہوگا‘ پھر یہ کوشش مسلسل جاری رکھنی پڑے گی کہ وہ قائم رہے۔''

۱۴۔مولانا امین احسن اصلاحیؒ ''تفسیر تدبر قرآن'' میں لکھتے ہیں:

''اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ یہ اس دنیا کا بھی بیان ہے جس کی تلقین ان نبیوں کو کی گئی اور اس ہدایت کا بھی جو اس دین سے متعلق ان نبیوں کے واسطہ سے ان کے پیروؤں کو کی گئی۔ الدِّین پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح الکتاب پر ہے۔ جس طرح الکتاب کے معنی اللہ کی کتاب کے ہیں' اسی طرح الدِّین کے معنی اللہ کے دین کے ہیں۔ اللہ کا دین شروع سے اسلام ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَام (اصل دین اللہ کے نزدک اسلام ہے)۔ اس دین کی بنیاد خالص اور کامل توحید پر ہے۔ یہی دین اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام' بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی دیا اور یہی دین اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ پر بھی نازل فرمایا۔ اس کے عقائد اور اس کی اساسات شروع سے آخر تک بالکل ایک ہیں۔ فرق اگر ہوا ہے تو جزئیات شریعت میں ہوا ہے جس کو قرآن نے شِرْعَةً وَّ مِنْهَاج کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس دین سے متعلق امتوں کو یہ ہدایت بھی فرمائی گئی تھی کہ اس کو قائم رکھنا اور اس میں اختلاف اور تفرق نہ برپا کرنا۔ یہ اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح فرمایا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران:۱۰۳) (سب مل کر اللہ کی رسی کو پکڑو اور متفرق نہ ہو)۔ قائم رکھنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی جو باتیں ماننے کی ہیں وہ سچائی کے ساتھ مانی جائیں' جو کرنے کی ہیں وہ دیانت داری اور راست بازی کے ساتھ کی جائیں۔ نیز لوگوں کی برابر نگرانی کی جائے کہ وہ اس سے غافل یا منحرف نہ ہونے پائیں اور اس بات کا بھی پورا اہتمام کیا جائے کہ اہلِ بدعت اس میں کوئی رخنہ نہ پیدا کر سکیں۔

لَا تَفَرَّقُوْا کا مطلب یہ ہے کہ یہی دین حبل اللہ ہے' اس وجہ سے سب کا فرض ہے کہ سب مل کر اس کو تھامیں' ایسا نہ ہو کہ جس کے ہاتھ میں جو رسی آ جائے اسی کو وہ حبل اللہ سمجھ بیٹھے اور اس رسی کو چھوڑ دے۔ اگر اِس حبل اللہ سے تعلق منقطع ہوا تو سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔ پھر کوئی چیز بھی لوگوں کی شیرازہ بندی نہ کر سکے گی۔''

۱۵۔مولانا گوہر رحمان صاحبؒ فرماتے ہیں:

''میں ۳۰ سال سے اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ کا ترجمہ اس طرح کرتا رہا ہوں اور اس کی تشریح اس طرح سمجھاتا رہا ہوں کہ ''پورے دین پر عمل کرو' اس کے کل احکام کی پابندی کرو اور اس میں تفرقہ' اختلاف اور پھوٹ نہ ڈالو کہ کچھ کو مانو اور کچھ کو نہ مانو' کچھ پر

عمل کرو اور کچھ کو چھوڑ دو' یا کوئی مانے اور کوئی نہ مانے۔ بلکہ تم سب کے سب پورے دین کو مان لو' اس پر عمل کرو' اس پر مجتمع اور متحد ہو جاؤ' اس لیے کہ یہ مقصدِ انبیاء ہے اور اُمت کے لیے ایک دینی فریضہ ہے۔'' (تفہیم المسائل' ج ۵)

۱۶۔ڈاکٹر اسرار احمدؒ ''بیان القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ کہ قائم کرو دین کو۔

اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا ہے کہ حضرات نوح' ابراہیم' موسیٰ' عیسیٰ علیہم السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کا یعنی تمام پیغمبروں کا دین ایک ہی ہے۔ یہی مضمون سورۃ الانبیاء میں اس طرح آیا ہے: اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ''یقیناً یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا رب ہوں' لہٰذا تم لوگ میری ہی بندگی کرو''۔ یعنی تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اور ان کی امتوں کا دین ایک ہی تھا۔ ان کے درمیان اگر کوئی فرق یا اختلاف تھا تو وہ شریعتوں میں تھا۔ دوسری اہم بات اس آیت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اقامتِ دین کا فریضہ ان تمام پیغمبروں کو سونپا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کو اس سلسلے میں جو حکم ملا تھا اس کا ذکر قرآن میں موجود ہے کہ تم لوگ ارضِ فلسطین کو فتح کرنے کے لیے جہاد کرو۔ ظاہر ہے اس خطہ پر قبضہ کرنے کا مقصد اللہ کے دین کو وہاں بالفعل نافذ کرنا تھا' چنانچہ اقامت دین کی جدوجہد ماقبل امتوں پر بھی فرض تھی۔

بہرحال اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کے حکم کا خلاصہ یہی ہے کہ زبان سے صرف عقیدۂ توحید کا اقرار کر لینا کافی نہیں' بلکہ اس عقیدے کا رنگ اپنے اعمال پر بھی چڑھاؤ اور نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی طور پر اپنے معاشرے کی اعلیٰ ترین (ریاستی اور حکومتی) سطح پر اس کی تنفیذ و تعمیل کو یقینی بناؤ۔ واضح رہے کہ مترجمین نے بالعموم ''اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ'' کا ترجمہ کیا ہے: ''کہ دین کو قائم رکھو!'' یہ بھی درست ہے کیونکہ اقامت دین کے حوالے سے کسی معاشرے میں دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو وہاں دین قائم ہے یا قائم نہیں ہے۔ چنانچہ اس حکم کا منشاء یہ ہے کہ اگر دین پہلے قائم ہے تو اسے قائم رکھو اور اگر قائم نہیں ہے تو اسے قائم کرو۔ مثلاً خیمہ اگر کھڑا ہے تو اسے گرنے سے بچانا ہے اور اگر پہلے سے کھڑا نہیں ہے تو اسے کھڑا (erect) کرنا ہے۔''

اقامتِ دین کے لیے استعمال ہونے والی دیگر اصطلاحات

مندرجہ بالا تصریحات سے یہ بات سامنے آ گئی کہ اقامت دین سے مراد ''دین کو قائم کرنا'' یعنی انفرادی و اجتماعی سطح پر توحید کی تنفیذ و قیام ہے۔ ذیل میں ہم اقامت دین کے لیے

استعمال ہونے والی دیگر اصطلاحات کا مختصر ذکر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ کچھ اصطلاحات قرآنی ہیں کچھ احادیث مبارکہ میں آئی ہیں اور کچھ عوامی نوعیت کی ہیں اور مختلف ادوار میں مختلف مفکّرین نے اسلام کے غلبہ کے لیے اپنے اپنے ماحول کے پیش نظر یہ اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ان اصطلاحات کی مختصر وضاحت درج ذیل ہے:

۱۔ تکبیرِ رب

﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ ﴾ (المدثر) ''اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو!'' کیونکہ رب کی بڑائی بولنے اور بزرگی وعظمت بیان کرنے ہی سے اس کا خوف دلوں میں پیدا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی تعظیم وتقدیس ہی وہ چیز ہے جس کی معرفت سب اعمال واخلاق سے پہلے حاصل ہونی چاہیے۔ بہرحال اس کے کمالات وانعامات پر نظر کرتے ہوئے نماز میں اور نماز سے باہر اس کی بڑائی کا اقرار واعلان کرنا تمہارا کام ہے۔ (تفسیرِ عثمانی)

ایک نبی کا سب سے پہلا اور بڑا کام یہ ہوتا ہے کہ جاہل انسان جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں' ان کی نفی کر دے اور ہانکے پکارے دنیا بھر میں یہ اعلان کر دے کہ اس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا کسی کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمہ ''اللہ اکبر'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے' اذان واقامت کی ابتداء اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے' نماز میں بھی مسلمان اللہ اکبر کہہ کر داخل ہوتا ہے' اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اٹھتا اور بیٹھتا ہے' اور جب ذبح کرتا ہے تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر' اور نعرۂ تکبیر پوری دنیا میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ نمایاں امتیازی شعار ہے' کیونکہ اس امت کے نبی نے اپنا کام ہی اللہ اکبر کی تکبیر سے شروع کیا ہے۔ (جلالین)

۲۔ خلافت

خلافة: الخلافة نيابة عن صاحب الشريعة فى حفظ الدين' وسياسة الدنيا به تسمى خلافة وامامة' والقائم به خليفة واماما۔

''خلافت دین کی حفاظت کے لیے اور دنیا کی سیاست کے لیے صاحبِ شریعت کی جانشینی ہے' لہٰذا اس جانشینی کو خلافت اور امامت کہا جاتا ہے۔ اور جو شخص اس کا انتظام کرتا ہے اسے خلیفہ اور امام کہتے ہیں۔'' (ابن خلدون)

۳۔ قیامِ عدلِ اسلامی

لِيَقُوْمَ النَّاسُ ''تاکہ لوگ قائم رہیں'' تاکہ وہ اپنے مابین برابری سرابری کے ساتھ معاملات کریں۔ بِالْقِسْطِ ''اعتدال کے ساتھ'' اور کوئی دوسرے پر ظلم نہ کرے۔ (مدارک التنزیل)

کسی معاشرہ میں عدل کے قیام کی یہی صورت ہے کہ حقوق اللہ بھی پوری طرح ادا کیے جائیں' یعنی اس کی توحید کا اقرار کیا جائے' بجا آوری میں غفلت نہ برتی جائے۔ اسی طرح حقوق العباد کا بھی پورا پورا لحاظ رکھا جائے' کسی کا حق تلف نہ کیا جائے' کسی پر زیادتی نہ جائے' کسی کے جان' مال اور آبرو پر دست درازی نہ کی جائے۔ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر عدل وانصاف کو بروئے کار لایا جائے اور اگر باہمی تنازعہ پیدا ہو جائے تو اس کا تصفیہ اس میزان یعنی عقلِ سلیم کے مطابق کیا جائے جسے حق وباطل میں امتیاز کی صلاحیت بخشی گئی ہو' اور اگر حق وانصاف کے سامنے کوئی شخص سرِ تسلیم خم نہیں کرتا' روشن اور واضح دلائل وبراہین کے بعد بھی اس باطل سے چمٹا رہتا ہے اور حق کو نیچا دکھانے کے لیے کوشاں رہتا ہے تو اس وقت اس کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور رسل کو لوہے کا ڈنڈا بھی عطا فرمایا ہے جس کی ایک ضرب اچھے اچھے بد دماغوں کا دماغ درست کر سکتی ہے۔ اللہ کا رسول (ﷺ) صرف حق سنانے کے لیے نہیں آتا بلکہ حق کو پھیلانا اور اس کی بالادستی قائم کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔ لیظهره على الدّين كلّه کی شان کا وہ مظہر بن کر آتا ہے۔ (ضیاء القرآن)

ان کے علاوہ اعلائے کلمۃ اللہ کی اصطلاح احادیث مبارکہ میں استعمال ہوئی ہے: ((لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا)) (بخاری' کتاب العلم) اور چند عام فہم اور عوامی اصطلاحات یہ ہیں: منصبِ امامت' نفاذِ شریعت' اسلامی انقلاب' حکومتِ الٰہیہ اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ وغیرہ۔

اقامتِ دین کا ہم معنی مضمون: قرآن مجید کی دیگر آیات میں

۱۔ ﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝٣ ﴾ (المدثر)

''اور اپنے رب کو بڑا کرو!'' (یعنی اپنے رب کی بڑائی کا اعلان ونفاذ کرو!)

۲۔ ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا

بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ؕ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾ (الشوریٰ)

''(اے مسلمانو!) اللہ نے تمہارے لیے دین میں وہی کچھ مقرر کیا ہے جس کی وصیت اس نے نوحؑ کو کی تھی اور جس کی وحی ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی طرف کی ہے' اور جس کی وصیت ہم نے کی تھی ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو کہ قائم کرو دین کو۔ اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ (اے نبی ﷺ) بہت بھاری ہے مشرکین پر یہ بات جس کی طرف آپ ان کو بلا رہے ہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف (آنے کے لیے) چُن لیتا ہے اور وہ اپنی طرف ہدایت اُسے دیتا ہے جو خود رجوع کرتا ہے۔''

۳۔ ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ (المائدۃ)

''اور اگر انہوں نے قائم کیا ہوتا تورات کو اور انجیل کو اور اس کو جو کچھ نازل کیا گیا تھا ان پر اِن کے رب کی طرف سے تو یہ کھاتے اپنے اوپر سے بھی اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔ ان میں کچھ لوگ ہیں جو درمیانی (یعنی سیدھی) راہ پر ہیں۔ لیکن ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو بہت بری حرکتیں کر رہے ہیں۔''

۴۔ ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾ (المائدۃ)

''اے رسول (ﷺ) پہنچا دیجیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے۔ اور اگر (بالفرض) آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اُس کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔ اور اللہ آپ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے۔ یقیناً اللہ کافروں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

۵۔ ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ (المائدۃ)

''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے: اے کتاب والو تم کسی چیز پر نہیں ہو جب تک تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ نازل کیا گیا ہے تم پر تمہارے رب کی طرف سے۔ لیکن (اے نبی ﷺ) جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے یہ ان کے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں یقیناً اضافہ کرے گا۔ تو آپ ان کافروں کے بارے میں افسوس نہ کریں۔''

۶۔ ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ (البقرۃ)

''اور لڑو ان سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو کوئی زیادتی جائز نہیں ہے مگر ظالموں پر۔''

۷۔ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ (النور)

''اللہ کا وعدہ ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ضرور انہیں زمین میں خلافت (غلبہ) عطا کرے گا' جیسے اُس نے ان سے پہلے والوں کو خلافت عطا کی تھی۔ اور وہ ضرور ان کے اس دین کو غلبہ عطا کرے گا جو اُن کے لیے اُس نے پسند کیا ہے اور وہ ان کی (موجودہ) خوف کی حالت کے بعد اس کو لازماً امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد بھی کفر کرے تو ایسے لوگ ہی فاسق ہیں۔''

۸۔ ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ (الحج)

''وہ لوگ کہ اگر انہیں ہم زمین میں تمکّن عطا کر دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور وہ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ اور تمام امور کا انجام تو اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔''

۹۔ ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (الانبیاء)

''اور ہم نے لکھ دیا تھا زبور میں نصیحت کے بعد کہ اس زمین کے وارث ہوں گے ہمارے نیک بندے۔''

۱۰۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ۡ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۴﴾﴾ (المائدۃ)

''اے ایمان والو! جو کوئی بھی پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے تو اللہ (کو کوئی پرواہ نہیں' وہ) عنقریب (تمہیں ہٹا کر) ایک ایسی قوم کو لے آئے گا جنہیں اللہ محبوب رکھے گا اور وہ اُسے محبوب رکھیں گے وہ اہلِ ایمان کے حق میں بہت نرم ہوں گے کافروں پر بہت بھاری ہوں گے اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی خوف نہیں کریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے' جس کو چاہے عطا کرتا ہے' اور اللہ بہت وسعت رکھنے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

۱۱۔ ﴿قُلْ لِّلْمُخَلَّفِیْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ ۚ فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ﴿۱۶﴾﴾ (الفتح)

''ان بدوؤں میں سے جو لوگ پیچھے رہ گئے تھے آپ ان سے کہہ دیجیے کہ عنقریب تمہیں بلایا جائے گا ایک ایسی قوم کے ساتھ مقابلے کے لیے جو بہت طاقتور ہوگی' یا تو تم ان سے قتال کرو گے یا وہ اطاعت قبول کر لیں گے۔ تو اس وقت اگر تم اطاعت کرو گے تو اللہ تمہیں بہت اچھا اجر دے گا۔ لیکن اگر تم نے (اس موقع پر بھی) پیٹھ دکھا دی جیسے کہ تم نے پہلے پیٹھ دکھائی تھی تو وہ تمہیں بہت دردناک عذاب دے گا۔''

۱۲۔ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۟ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾﴾ (الفتح)

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو ان کے ساتھ ہیں' وہ کافروں پر بہت بھاری اور آپس میں بہت رحم دل ہیں تم دیکھو گے انہیں رکوع کرتے ہوئے' سجدہ کرتے ہوئے' وہ (ہر آن) اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی رہتے ہیں ان کی پہچان ان کے چہروں پر (ظاہر) ہے سجدوں کے اثرات کی وجہ سے۔ یہ ہے ان کی مثال تورات میں۔ اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی کونپل' پھر اس کو تقویت دی' پھر وہ سخت ہوئی' پھر وہ اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔ یہ کاشتکار کو بڑی بھلی لگتی ہے تاکہ ان سے کافروں کے دل جلائے۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے' مغفرت اور اجرِ عظیم کا۔''

۱۳۔ ﴿یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾﴾ (الصف)

''وہ تلے ہوئے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مُنہ (کی پھونکوں) سے بجھا کر رہیں گے اور اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا' خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔''

۱۴۔ ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۹﴾﴾ (الصف)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُس کو پورے نظامِ زندگی پر اور خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔''

۱۵۔ ﴿كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾﴾ (آل عمران)

''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے تم حکم کرتے ہو نیکی کا اور تم روکتے ہو بدی سے اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔ اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لے آتے تو یہ ان کے حق میں بہتر تھا۔ ان میں سے کچھ تو ایمان والے ہیں لیکن ان کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔''

۱۶۔ ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا

تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾ (الحدید)

''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں' جبکہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت! تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے انفاق کیا اور قتال کیا فتح سے پہلے وہ (فتح کے بعد انفاق اور قتال کرنے والوں کے) برابر نہیں ہیں۔ ان لوگوں کا درجہ بہت بلند ہے ان کے مقابلے میں جنہوں نے انفاق اور قتال کیا فتح کے بعد۔ اگرچہ ان سب سے اللہ نے بہت اچھا وعدہ فرمایا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

۱۷۔ ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾﴾ (الحجر)

''یقیناً ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

۱۸۔ ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾﴾ (الحدید)

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان اُتاری' تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے' اس میں شدید جنگی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دوسری منفعتیں بھی ہیں۔ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون مدد کرتا ہے اُس کی اور اُس کے رسولوں کی غیب میں ہونے کے باوجود۔ یقیناً اللہ بہت قوت والا' بہت زبردست ہے۔''

۱۹۔ ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾﴾ (القیامة)

''آپ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔''

۲۰۔ ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾﴾ (القیامة)

''اسے جمع کرنا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔''

۲۱۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾﴾ (القیامة)

''پھر جب ہم اسے پڑھوا دیں تو آپ اس کی قراءت کی پیروی کیجیے۔''

۲۲۔ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾﴾ (القیامة)

''پھر ہمارے ہی ذمے ہے اس کو واضح کر دینا بھی۔''

نوٹ: مندرجہ بالا آیات کا انتخاب شاہ ولی اللہؒ کی کتاب ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'' اور ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی کتاب ''حزب اللہ کے اوصاف'' سے کیا گیا ہے اور ان آیات کا ترجمہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے ''بیان القرآن'' سے لیا گیا ہے۔

اقامتِ دین کا ذکر احادیثِ مبارکہ میں

۱۔ ((وَاِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ فِيْ قُرَيْشٍ، مَا اَطَاعُوا اللّٰهَ وَاسْتَقَامُوْا عَلٰى اَمْرِهٖ..... اَلْوُلَاةُ مِنْ قُرَيْشٍ، مَا اَطَاعُوا اللّٰهَ وَاسْتَقَامُوْا عَلٰى اَمْرِهٖ))

(کنز العمال' ج۳' حدیث نمبر ۲۲۷۶)

''اور یہ بارِ خلافت قریش میں رہے گا جب تک کہ وہ اللہ کی عبادت کرتے رہیں اور سیدھی راہ پر گامزن رہیں..... حکام قریش میں ہوں گے جب تک کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتے رہیں اور اس کے دین پر ثابت قدم رہیں۔''

(کنز العمال' ج ۳' حدیث نمبر ۲۲۷۶)

۲۔ ((اِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ فِيْ قُرَيْشٍ، لَا يُعَادِيْهِمْ اَحَدٌ اِلَّا كَبَّهُ اللّٰهُ فِي النَّارِ عَلٰى وَجْهِهٖ، مَا اَقَامُوا الدِّيْنَ)) (صحیح البخاری، کتاب المناقب والاحکام)

''یہ اقتدار (خلافت) قریش میں رہے گا۔ جو بھی اس بارے میں ان سے دشمنی کرے گا تو اللہ اس کو اوندھے منہ آگ میں ڈال دے گا' جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں۔''

۳۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فضیلت و کام کے متعلق حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ (سنن ابن ماجه' کتاب النکاح)

''اللہ تعالیٰ نے ان (صحابہ) کو اپنے نبی ﷺ کی رفاقت اور اقامت دین کے لیے چُن رکھا تھا۔''

اور ایک اور روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

۴۔ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ، فَاِنَّ الْحَيَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ، اُولٰئِكَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ كَانُوْا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ، اَبَرَّهَا قُلُوْبًا، وَاَعْمَقَهَا عِلْمًا، وَاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا، اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ، فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ، وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى آثَارِهِمْ، وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ اَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ، فَاِنَّهُمْ كَانُوْا

عَلَی الْهُدَی الْمُسْتَقِیْمِ (مشکوۃ المصابیح: جلداول: حدیث ۱۸۷)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی کسی طریقہ کی پیروی کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ ان لوگوں کی راہ اختیار کرے جو فوت ہو گئے ہیں' کیونکہ زندہ آدمی (دین میں) فتنہ سے محفوظ نہیں ہوتا' اور وہ لوگ جو فوت ہو گئے ہیں (اور جن کی پیروی کرنی چاہیے) رسول اللہ ﷺ کے اصحاب (رضی اللہ عنہم) ہیں' جو اس امت کے بہترین لوگ تھے۔ دلوں کے اعتبار سے انتہا درجہ کے نیک' علم کے اعتبار سے انتہائی کامل اور بہت کم تکلف کرنے والے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی رفاقت اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے منتخب کیا تھا' لہٰذا تم ان کی بزرگی کو پہچانو اور ان کے نقش قدم کی پیروی کرو' اور جہاں تک ہو سکے ان کے آداب واخلاق کو اختیار کرتے رہو (اس لیے کہ) وہی لوگ ہدایت کے سیدھے راستہ پر تھے۔''

۵۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
((اِسْتَقِیْمُوْا لِقُرَیْشٍ مَا اسْتَقَامُوْا لَکُمْ، فَاِذَا زَاغُوْ عَنِ الْحَقِّ فَضَعُوْا سُیُوْفَکُمْ عَلٰی عَوَاتِقِکُمْ، ثُمَّ اَبِیْدُوْا خَضْرَاءَ هُمْ)) (المعجم الصغیر للطبرانی ۷۴/۱)

''تم قریش کی اطاعت پر قائم رہو جب تک کہ وہ تمہارے لیے حق پر قائم رہیں' پھر جب وہ حق سے پھر جائیں تو تم اپنی تلواریں کاندھوں پر رکھو اور پھر ان کے سربرآوردہ لیڈروں کو ہلاک کر دو۔''

۶۔ عَنْ حُذَیْفَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((تَکُوْنُ النُّبُوَّةُ فِیْکُمْ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَةً عَلٰی مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ یَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا عَاضًّا، فَیَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ یَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَکُوْنُ مُلْکًا جَبْرِیَّةً فَتَکُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَکُوْنَ، ثُمَّ یَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ یَّرْفَعَهَا، ثُمَّ تَکُوْنُ خِلَافَةً عَلٰی مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ)) ثُمَّ سَکَتَ (مسند احمد، رواہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ)

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نبوت تمہارے درمیان رہے گی جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر خلافت کا دور آئے گا جو نبوت

کے طریق پر ہوگا۔ پھر یہ دور بھی اس وقت رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر جب اللہ چاہے گا اسے اٹھا لے گا۔ پھر کاٹ کھانے والی بادشاہت آجائے گی۔ یہ دور رہے گا جب تک اللہ چاہے گا۔ پھر جب اللہ اسے اٹھانا چاہے گا تو اٹھا لے گا۔ اس کے بعد تم پر زبردستی (بیرونی) حاکم مسلط ہو جائیں گے' پھر اللہ تعالیٰ اس دور کو بھی اٹھا لے گا جب چاہے گا۔ پھر خلافت کا دور آئے گا جو نبوت کے طریق پر ہوگا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمالی۔''

۷۔ عن ثوبان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللّٰہ ﷺ: ((اِنَّ اللّٰهَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا' وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُهَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْهَا))
(مسلم' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجه)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو لپیٹ دیا یعنی اسے اکٹھا کر دیا۔ پس میں نے اس کے تمام مشرق ومغرب دیکھ لیے' اور میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچ کر رہے گی جو میرے لیے لپیٹی گئی۔''

(جاری ہے)

❁❁❁

ایک مسلمان سے دین کے تین اہم تقاضے

مُطالباتِ دین

• عبادتِ رب • فریضہ شہادت علی الناس
• فریضہ اقامتِ دین

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ

صفحات: 120 قیمت: 90 روپے

ملک عزیز پاکستان میں سیکولرازم اور لبرل ازم کے بڑھتے ہوئے رجحانات کے سدِباب اور نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ کا ایک قابلِ عمل اور مؤثر طریق کار

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

۱۸ ستمبر ۲۰۱۷ء کو ملّی یکجہتی کونسل کی مجلس قائدین کا ایک اجلاس ٹوپاز بینکوئٹ ہال' جوہر ٹاؤن' لاہور میں تنظیم اسلامی کی میزبانی میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں امیر تنظیم اسلامی محترم حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ نے خصوصی مقالہ پیش کیا۔ اجلاس میں اکثریت انتخابی سیاست میں حصہ لینے والی جماعتوں کی تھی جن کے سامنے تنظیم اسلامی کا یہ موقف پیش کیا گیا کہ دینی سیاسی جماعتوں کو اقامتِ دین کی خاطر الیکشن کے ناکام تجربات کے بعد ایک بھرپور' منظم اور پُرامن عوامی تحریک کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ ''دعوتِ فکرِ اسلامی مہم'' کے تحت امیر تنظیم کا مقالہ ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟﴾ (آل عمران: ۱۹)

﴿وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ﴾ (آل عمران: ۸۵)

﴿اَفَحُکۡمَ الۡجَاہِلِیَّۃِ یَبۡغُوۡنَ ؕ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکۡمًا لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ ۵۰﴾ (المائدۃ)

﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ۴۴﴾ (المائدۃ)

﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۴۵﴾ (المائدۃ)

﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ۴۷﴾ (المائدۃ)

میں ملی یک جہتی کونسل کے صدر' محترم صاحبزادہ ابوالخیر زبیر صاحب اور سیکرٹری جنرل لیاقت بلوچ صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس نہایت اہم ملی و قومی سطح کے پلیٹ فارم پر تفصیلی اظہارِ خیال کا خصوصی موقع عطا فرمایا۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ گزشتہ سربراہی اجلاس کے موقع پر جو متفقہ اعلامیہ تیار کیا گیا تھا' اس کے باضابطہ اعلان سے قبل محترم لیاقت بلوچ صاحب نے کمال شفقت سے وہ اعلامیہ مجھے بھی دکھایا تاکہ میں اگر اس میں کوئی قطع و برید یا حک و اضافہ کرنا چاہوں تو تجویز کر دوں۔ اس اعلامیے میں حسبِ معمول ملکی و قومی سطح کے بہت سے issues کے حوالے سے حکومت وقت کے نامناسب طرزِ عمل اور دین دشمن اقدامات کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی گئی تھی۔ میں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ comment لکھ کر محترم لیاقت بلوچ صاحب کو واپس تھما دیا کہ آخر کب تک صرف مذمت ہی پر اکتفا کرتے رہیں گے' کوئی ٹھوس لائحہ عمل سوچنا چاہیے۔

اس پر پنجابی کے محاورے ''جیہڑا بولے اوہی کنڈا کھولے'' کے مصداق جناب لیاقت بلوچ صاحب نے جواباً یہ کام میرے ذمے ڈال دیا اور فرمایا کہ ٹھوس لائحہ عمل آپ تجویز کریں۔ ساتھ ہی یہ اعلان فرما دیا کہ ملی یکجہتی کونسل کی سپریم کونسل کا آئندہ اجلاس لاہور میں ہوگا' اس کی میزبانی تنظیم اسلامی کرے گی اور اس میں امیر تنظیم اسلامی' پاکستان کے موجودہ مسائل کے حوالے سے ٹھوس لائحہ عمل تفصیل سے بیان کریں گے۔ چنانچہ آج کے اجلاس کی میزبانی کا شرف تنظیم کو حاصل ہوا ہے اور طے شدہ فیصلے کے مطابق مجھے دینی جماعتوں کے اس قابلِ احترام فورم کے سامنے وہ راستہ یا لائحہ عمل تجویز کرنا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر ہم مملکت پاکستان کو حقیقی معنوں میں ایک اسلامی فلاحی ریاست کے قالب میں ڈھال سکیں۔ حضراتِ محترم!

میرے نزدیک یہ ہماری قومی زندگی کے اہم ترین issue کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن و سنت کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میرا احساس یہ ہے کہ ہم مسلمانانِ پاکستان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی کے حوالے سے یہ issue ایک فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے۔

موضوع پر براہ راست گفتگو سے قبل چند تمہیدی باتیں عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

پہلی بات یہ ہے کہ پوری اُمّتِ مُسلمہ اور بالخصوص ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے حوالے سے علامہ اقبال کا یہ فرمان صدفی صد درست ہے کہ ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیّت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری!

حضراتِ محترم! یہ ایک امر واقعہ ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور معجزانہ طور پر ہمیں عطا ہوا ہے۔ اس کا قیام ماہ رمضان کی ستائیسویں شب میں عمل میں آیا۔ لہٰذا پاکستان کا استحکام ہی نہیں اس کی بقا کا انحصار بھی حقیقی اسلامی نظام کے قیام پر ہے۔ آدھا ملک ہم گنوا چکے ہیں اور بقیہ آدھا بحرانوں اور گوناگوں مسائل کی آماج گاہ بنا رہتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا!

دوسری تمہیدی بات‘ یہ درست ہے کہ یہاں کے عوام میں ۹۶ فیصد افراد مسلمان ہیں۔ غیر مسلم اقلیت یہاں اتنی قلیل ہے کہ وہ اسلام کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت بلکہ المیہ ہے کہ ریاستی نظام کی سطح پر اسلام کی عملداری صفر ہے۔ آج بھی پورا ریاستی نظام انگریز کے چھوڑے ہوئے نظام پر استوار ہے۔ کہنے کو حدود آرڈیننس اس ملک میں نافذ ہوا‘ لیکن چونکہ پورا عدالتی نظام اب بھی انگریز کے بنائے ہوئے اصولوں پر چل رہا ہے جو اس نے بطور حاکم ہمارے اوپر مسلّط کیا تھا‘ لہٰذا یہ قطعی غیر مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ تاریخ کا سب سے بڑا مذاق ہے کہ کہنے کو حدود آرڈیننس اس ملک میں نافذ ہوئے ایک تہائی صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج تک کسی چور کا ہاتھ کاٹا گیا نہ کسی زانی پر حد جاری کی گئی —— گویا ۲۰ کروڑ مسلمانوں کے اس ملک میں آج تک نہ کوئی چوری کی واردات ہوئی اور نہ زنا کا کوئی واقعہ پیش آیا۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے! دین کے ساتھ اس سے بڑا مذاق اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح قیام پاکستان کو ۷۰ سال سے زائد ہو چکے ہیں لیکن آج بھی پوری ملکی معیشت سود پر استوار ہے جس کی مذمت میں قرآن و حدیث میں سخت ترین وعید آئی ہے۔ اس حوالے سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم قیام پاکستان سے آج تک اللہ اور رسول

ﷺ کے خلاف حالتِ جنگ میں ہیں۔ مجھے بتایئے کہ ان حالات میں اللہ کی نصرت اور رحمت ہمارے شامل حال کیونکر ہو سکتی ہے؟ ہاں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کو ہم ہر آن دھڑلے سے دعوت دیتے ہیں اور ہمارے احساسات پر جوں تک نہیں رینگتی۔ الا ماشاء اللہ!

اسی طرح معاشرتی سطح پر جائزہ لیا جائے تو بے لگام الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پورے ملک میں عریانی اور فحاشی یعنی ابلیسی تہذیب کا ایک سیلاب نظر آتا ہے۔ یہ الیکٹرانک میڈیا آج ہمارے حواس پر آسیب کی طرح سوار ہے۔ ملکی و سرکاری سطح پر اس شیطانی ایجنڈے کی بھرپور سرپرستی کی جا رہی ہے اور اسلامی معاشرتی تعلیمات اور دینی اقدار کی عمداً دھجیاں بکھیری جاتی ہیں۔ مختصراً یہ کہ آج بحیثیت قوم ہمارا پورا اجتماعی نظام اللہ اور رسول ﷺ سے کھلی بغاوت کی غمازی کر رہا ہے۔ ہماری اس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم نہ صرف یہ کہ اللہ کی رحمت اور نصرت سے محروم ہیں بلکہ پوری دنیا میں ذلت و خواری ہمارا مقدر بنی ہوئی ہے۔ انٹرنیشنل ایئرپورٹس پر ہمارے ’’گرین پاسپورٹ‘‘ کی جو ’’عزت افزائی‘‘ ہوتی ہے وہ انتہائی رسوا کن بھی ہے‘ عبرت ناک بھی۔ چنانچہ امر واقعہ ہے کہ آج ہم عملاً آیت قرآنی ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ﴾ (البقرہ: ۶۱) کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔ اسی ذلت و مسکنت کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ مسلسل قرض کی مے پینے کے نتیجے میں آج ہم معاشی طور پر ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی بدترین غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے اس مجرمانہ طرزِ عمل کے نتیجے میں عذاب کا ایک عبرت ناک کوڑا سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں ہماری پیٹھ پر برس چکا ہے۔ اپنے ازلی دشمن کے مقابلے میں ذلت آمیز شکست کا داغ ہمیں دیکھنا پڑا‘ لیکن افسوس کہ ہم نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ اسی طرح زلزلوں اور سیلابوں کے عذاب کے ذریعے بھی اللہ تعالیٰ نے ہمیں جگانے کا سامان کیا۔ بلکہ عذاب کی ایک اور شکل کا ذکر بھی قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ﴾ (الانعام: ۶۵) اس خوفناک عذاب کا مزہ بھی ہمیں لسانی‘ مسلکی اور سیاسی بنیادوں پر بدترین ٹارگٹ کلنگ کی صورت میں چکھنا پڑا۔ لیکن ہم نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس ملک میں اللہ کے دین کو قائم اور غالب کر کے اللہ کو راضی کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی —— ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کی‘ بلکہ عالمِ اسلام کا واحد سُنّی

اکثریتی ملک‘ افغانستان جس میں ملاعمرؒ کے دورِ اقتدار میں اللہ کا دین قائم اور محمد عربی ﷺ کی عطا کردہ شریعت نافذ تھی‘ اور اس دور میں جو بھی افغانستان جاتا تھا وہ یہ کہتا ہوا واپس آتا تھا کہ دورِ خلافت راشدہ کی یاد تازہ ہوگئی‘ اس کی خالص اسلامی حکومت کو ختم کرنے میں ہم نے اللہ کے بدترین دشمنوں کی صف میں کھڑے ہو کر ان کے فرنٹ لائن اتحادی کا کردار ادا کیا —— آج وہی امریکہ جس کے شیطانی ایجنڈے کی تکمیل اور خوشنودی کی خاطر ہم نے اپنے ہزاروں فوجی جوانوں اور ہزارہا شہریوں کی جانوں کا نقصان گوارا کیا‘ آج ہمیں ننگے لفظوں میں عبرت ناک انجام کی دھمکیاں دے رہا ہے اور اس نے اپنی حمایت کا سارا وزن ہمارے ازلی دشمن بھارت کے پلڑے میں ڈال دیا ہے۔

حضرات محترم! آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب ہمارے حکمرانوں کا قصور ہے‘ لیکن میں بصد ادب عرض کروں گا کہ جب حکمران طبقہ اپنی ذمہ داری ادا نہ کرتا ہو تو قوم کی اصلاح اور مثبت دینی رہنمائی ہی کی نہیں‘ دینی ذہن سازی کی ذمہ داری بھی رجالِ دین پر آتی ہے۔ از روئے قرآن‘ مسلم معاشرے میں دینی طبقات کی اہم ترین ذمہ داری ''نہی عن المنکر'' کی ہے۔ سورۃ المائدۃ میں یہود کے علماء کا جرمِ عظیم یہ بتایا گیا: ﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ﴾۔ مزید برآں اسی سورہ میں بات کو مزید کھولا گیا: ﴿لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ﴾۔ برا نہ مانیے گا‘ ہم دینی جماعتوں نے اپنی ان اہم ترین دینی ذمہ داریوں یعنی منکرات کے خلاف بھرپور جہاد بالسّان کے تقاضے پورا کرنے اور عوام الناس کی اسلامی و ایمانی حوالوں سے مثبت ذہن سازی کرنے اور اس طرح ملک میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے انہیں آمادۂ عمل کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کے متبادل کے طور پر ہم نے انتخابات میں حصہ لینے اور اس طرح اقتدار میں آنے کی کوشش کو اپنا شعار بنالیا کہ اس طور سے اقتدار میں آ کر ہم شریعت کے نفاذ اور دین کی بالادستی کا نظام قائم کریں گے —— اور ستم بالائے ستم یہ کہ انتخابات میں کامیابی کے حصول کے لیے سیکولر جماعتوں کے ساتھ الحاق کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا‘ جو قطعی طور پر ناقابلِ فہم ہے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔ حاضرین محترم! اگرچہ ہم انتخابات کے ذریعے حکومتی ایوانوں میں پہنچ کر شریعت کے نفاذ کی کوشش کو فی نفسہٖ خلاف اسلام نہیں سمجھتے‘ لیکن ۷۰ سال کے تجربے کے بعد

بھی اور مسلسل ناکامی کے بعد بھی اسی ایک طریقے پر جازم رہنا میرے جیسے کند ذہن شخص کے لیے قطعی طور پر ناقابلِ فہم ہے۔ بالخصوص ''ایم ایم اے'' کے تجربے کے بعد بھی اسی ایک راستے پر جازم رہنا قطعی طور پر سمجھ سے باہر ہے!

میں اپنی گفتگو کے آخری اور اہم ترین حصے پر پہنچ گیا ہوں کہ متبادل راستہ کون سا ہے؟ اس کے لیے چند منٹ مزید آپ کی سمع خراشی کے لیے پیشگی معذرت کا خواہاں ہوں۔

حضرات محترم! فی زمانہ ہمارے لیے ''الیکشن‘ ممبری‘ کرسی‘ صدارت'' والے راستے کی ناکامی کے بعد‘ علمی اور عملی طور پر دو ممکنہ راستے موجود ہیں۔ ان میں سے ایک feasible نہیں ہے اور کسی طور مناسب بھی نہیں ہے‘ جبکہ دوسرا قابل عمل بھی ہے اور محفوظ بھی۔ ان دو میں سے پہلا راستہ مقتدر طبقات کے خلاف مسلح بغاوت کا ہے‘ جو ہمارے نزدیک فی زمانہ بہت سے اعتبارات سے feasible اور مناسب نہیں ہے۔ دوسرا راستہ ایک بھرپور عوامی تحریک کا ہے جو فی زمانہ بہت مؤثر بھی ہے‘ معروف بھی ہے اور محفوظ بھی۔

دورِ حاضر میں ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ شہنشاہیت کے خاتمے کے لیے وہاں کے باشعور عوام نے ایک زبردست تحریک چلائی جو پُرامن لیکن بہت بھرپور تھی۔ ایران کے عوام اور راہنماؤں نے ایک عظیم مقصد کے لیے قربانیاں دی تھیں۔ حکومت نے انہیں کچلنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پولیس کو استعمال کیا‘ فوج کو استعمال کیا گیا۔ لیکن جب عوام اور ان کی قیادت نے استقامت کا مظاہرہ کیا تو بالآخر شہنشاہِ وقت کو ذلت کے ساتھ ملک بدر ہونا پڑا کہ ع دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں۔ آج کے دور میں ایک بھرپور عوامی تحریک کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ دور کیوں جاتے ہیں‘ خود ہمارے وطن عزیز میں عوامی تحریک کے ذریعے بعض اہم دینی issues کے حوالے سے کامیابی کے حصول کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ چنانچہ جہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں الیکشن کے راستے سے جدوجہد کے نتیجے میں نظام مصطفیٰ ﷺ اور شریعتِ محمدی ﷺ کے نفاذ میں آج تک ہمیں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی‘ یہاں تک کہ ایم ایم اے کا تجربہ بھی ملک میں نفاذ شریعت کے حوالے سے قطعی ناکام ثابت ہوا اور کامیابی صرف اس قدر تھی کہ پاکستان کے دو صوبوں میں سیاسی اعتبار سے ہمیں اقتدار میں شراکت کا موقع ملا‘ جبکہ شریعت کے بالفعل نفاذ اور موجودہ باطل

نظام کی جڑ بنیاد سے تبدیلی کے حوالے سے ہم کوئی مؤثر کام کرنے سے یکسر قاصر رہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کبھی ہماری دینی جماعتوں نے کسی دینی issue کے حوالے سے متحد ہو کر عوامی تحریک کا راستہ اختیار کیا' اللہ ربّ العزت نے ہمیشہ کامیابی عطا فرمائی۔ ۱۹۷۴ء کی اینٹی قادیانی موومنٹ اور ابھی محض پانچ سال قبل ''تحفظِ ناموسِ رسالت کی تحریک'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔ کیا گزشتہ ستر سال کا یہ تجربہ کافی نہیں ہے کہ ہم اس کی روشنی میں اپنے لائحۂ عمل کو از سرِ نو مرتب کریں۔

حاصلِ کلام یہ کہ غلبہ و اقامتِ دین کی خاطر ایک بھرپور اور منظم عوامی تحریک جو پُرامن بھی ہو' آج ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' اس ملک میں جزوی طور پر مختلف issues پر ہم نے عوامی تحریک کا راستہ اختیار کیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں کامیابی عطا فرمائی —— لیکن افسوس اور رنج کا مقام یہ ہے کہ آج تک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے کوئی حقیقی تحریک ہم نے اس ملک میں نہیں چلائی۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ۱۹۷۷ء کی نظام مصطفیٰؐ تحریک' حقیقی معنوں میں نظام مصطفیٰؐ تحریک نہیں تھی۔ یہ اصلاً اینٹی بھٹو تحریک تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات جو بھٹو صاحب نے اپنی نگرانی میں کرائے تھے' اس کے نتائج کو تسلیم کرنے سے اپوزیشن نے انکار کیا اور تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ اس حوالے سے پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں بھٹو صاحب کے خلاف متحد ہو گئی تھیں۔ تحریک اٹھانے میں سب سے اہم اور فعال کردار ایئر مارشل (ر) اصغر خان کا تھا (جو اُس وقت تحریک استقلال کے صدر تھے)۔ وہ پاکستان میں سیکولر قوتوں کے سرخیل تھے۔ دوسرے لفظوں میں نظامِ مصطفیٰؐ کے بدترین مخالف۔ انہوں نے تمام سیاسی جماعتوں کو اکٹھا کیا' PNA (پاکستان نیشنل الائنس) کے نام سے ایک اتحاد تشکیل دیا اور بھٹو صاحب کے خلاف تحریک چلانے کا اعلان کیا۔ ابتدا میں اس اتحاد کو ''نوستاروں کی تحریک'' کہا گیا' اس لیے کہ اس میں پیپلز پارٹی کے سوا ملک کی دیگر تمام نو سیاسی جماعتیں شریک تھیں۔ تحریک کے ابتدائی مراحل میں ہی محسوس کر لیا گیا کہ تحریک کا momentum نہیں بن پا رہا تو مصلحتاً اس کا نام نظام مصطفیٰ تحریک رکھ دیا گیا تاکہ لوگ قربانی دینے پر آمادہ ہوں اور اس اتحاد کے صدر کا مقام مولانا مفتی محمود کو دیا گیا —— میں

یہاں تاریخ کے ریکارڈ کو درست رکھنے کے حوالے سے یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ جب اس اینٹی بھٹو تحریک یعنی PNA کو نظام مصطفیٰؐ کا عنوان دینے کا اعلان ہوا تو والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ نے اسی وقت ساتھیوں کے سامنے اپنے ان تاثرات کا اظہار فرمایا کہ یہ دین کے نام پر دھوکا دیا جا رہا ہے۔ اُن کا موقف یہ تھا کہ یہ خالص اینٹی بھٹو تحریک ہے جس میں ملک کے بدترین سیکولر عناصر شامل ہیں۔ ان کا مقصد بھٹو کو اقتدار سے ہٹانا ہے۔ جس دن یہ مقصد حاصل ہو گیا' یہ تحریک از خود ختم ہو جائے گی۔ اس پر والد محترم کو شدید مخالفت یہاں تک کہ گالیوں تک کا سامنا کرنا پڑا۔ مسجدِ خضراء سمن آباد میں جمعہ کی خطابت (جو خالص اعزازی تھی) سے سبکدوش ہونا پڑا۔ لیکن انہیں جو کھلی آنکھوں سے نظر آ رہا تھا وہ اس پر قائم رہے —— اور پھر تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ان کی بات سو فیصد درست تھی۔ بہرکیف اس تجربے کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ ثابت ہو گیا کہ ''نظام مصطفیٰ ﷺ'' کے حوالے سے قوم سر دھڑ کی بازی لگانے کے لیے تیار ہے۔ اس عنوان میں بڑی زبردست کشش ہے۔ تحریک چلانے والے قائدین اگر محمدِ عربی ﷺ کے عطا کردہ نظام کے حقیقی وفادار ہوں تو عوام ان کا بھرپور ساتھ دیں گے اور کوئی قوت اس عوامی دباؤ کے سامنے ٹھہر نہیں سکے گی۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ حقیقی معنوں میں نظامِ مصطفیٰؐ کی تحریک اس ملک میں ایک بار بھی نہیں چلائی گئی' ہاں بعض دینی issues پر دینی جماعتوں نے مل کر تحریکیں ضرور چلائی ہیں اور اللہ نے انہیں سرخرو بھی فرمایا۔ بلکہ ہماری دینی جماعتوں نے بعض مواقع پر بحالیٔ جمہوریت کی تحریک چلا کر اس میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں یہ سمجھنے سے قطعی طور پر قاصر ہوں کہ ہم مل جل کر نظام مصطفیٰؐ کے قیام کے لیے تحریک چلانے سے کیونکر گریزاں ہیں' حالانکہ اللہ ربّ العزت اور محمد رسول اللہ ﷺ سے وفاداری کا یہ بنیادی اور لازمی تقاضا ہے۔ اب بھی ہمارے لیے موقع ہے کہ اللہ ربّ العزت اور نبی اکرم ﷺ سے وفاداری کے لازمی تقاضے کے طور پر حقیقی معنوں میں ''نظامِ مصطفیٰ ﷺ'' کی تحریک چلا کر ہم اللہ کی نگاہ میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

میں آخر میں اپنے اس موقف کی تائید میں ایک دلیل یا گواہی مزید پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اپریل ۲۰۱۰ء میں اکابر دیوبند کا ایک اہم اجلاس جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہوا جو کئی دن تک جاری

رہا۔ اس میں ملک کے دگرگوں حالات‘ مدارس کے حوالے سے حکومت کی پالیسی‘ خودکش دھماکوں کی روک تھام کیسے کی جائے‘ وغیرہ جیسے مسائل پر غور کیا گیا۔ پورے پاکستان سے مسلک دیوبند کے اکابر علماء اس میں شریک ہوئے۔

اس سہ روزہ اجلاس کے آخر میں گفتگو اور غور وخوض کا حاصل ایک متفقہ اعلامیہ ’’متفقہ تشخیص‘‘ کے عنوان سے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کیا گیا۔ اس ’’متفقہ اعلامیہ‘‘ کے آغاز میں اس حقیقت کا کھلے لفظوں میں اظہار کیا گیا ہے کہ پاکستان میں جو بگاڑ‘ زوال اور انحطاط اور بدامنی ہے اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم نے اللہ کے عطا کردہ اس ملک میں اللہ کے دین اور محمد رسول اللہ ﷺ کے عطا کردہ نظام کو قائم اور غالب نہیں کیا۔ گویا میرے بیان کردہ موقف کی مکمل تائید۔

اگلے دو نکات بھی میری آج کی گفتگو کی صدفی صد تصدیق کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

۱) اس بات پر ہمارا ایمان غیر متزلزل ہے کہ اسلام ہی نے یہ ملک بنایا تھا اور اسلام ہی اسے بچا سکتا ہے‘ لہٰذا حکومت کا فرض ہے کہ وہ ملک میں اسلامی تعلیمات اور قوانین کو نافذ کرنے کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارا دینی فریضہ بھی ہے اور ملک کے آئین کا اہم ترین تقاضا بھی‘ اور اسی کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے ملک میں انتہا پسندی کی تحریکیں اٹھی ہیں۔ اگر ہم نے اپنے اس مقصد وجود کی طرف واضح پیش قدمی کی ہوتی تو ملک اس وقت انتہا پسندی میں نہ ہوتا۔ لہٰذا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے کہ پُرامن ذرائع سے پوری نیک نیتی کے ساتھ ملک میں نفاذ شریعت کے اقدامات کیے جائیں۔

۲) تمام سیاسی اور دینی جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے دوسرے مقاصد پر نفاذِ شریعت کے مطالبے کو اولیت دے کر حکومت پر دباؤ ڈالیں‘ اور اس غرض کے لیے مؤثر مگر پُرامن جدوجہد کا اہتمام کریں‘ جبکہ عوام کا فرض ہے کہ جو جماعتیں اور ادارے اس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں‘ ان کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔

حضرات محترم! یہ بالکل وہی بات ہے جس کی دعوت والد محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ گزشتہ ۳۷ برس سے دے رہے ہیں۔ گویا ع ’’متفق گردید رائے بوعلی با رائے من!‘‘

جگر مُرادآبادی کا ایک شعر ذہن میں آتا ہے۔ ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

میں اکابر دیوبند کے اس حقیقت پسندانہ اعلامیے پر‘ جو بہترین تشخیص اور بہترین قابلِ عمل لائحہ عمل پر مشتمل ہے‘ انہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں — لیکن ’’حیراں ہوں‘ دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں‘‘ کے مصداق شدید رنج وغم اس بات پر ہے کہ اس اعلامیہ کو مرتب ہوئے آج ساڑھے سات برس ہو چکے ہیں‘ لیکن اس پر عمل کے حوالے سے بدقسمتی سے ایک انچ کی پیش رفت بھی نظر نہیں آتی۔ ؎

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اِک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!

آخر میں‘ میں اپنی تلخ نوائی پر معافی کا خواستگار ہوں۔ غالب کا یہ شعر میرے جذبات کی بہتر ترجمانی کرتا ہے: ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے!

مجھے یقین ہے کہ اگر ملّی یک جہتی کونسل کا یہ پلیٹ فارم تمام دینی جماعتوں کو تحریک کے لیے یک جہت کرنے کا عزم کر لے تو‘ ان شاء اللہ‘ اصل مقصود یعنی غلبہ و اقامت دین / نظام مصطفیٰ کا نفاذ یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِھٰذَا!

پاکستان میں نفاذ اسلام کی تحریک چلانے کے حوالے سے ماحول بہت سے حوالوں سے نہایت سازگار ہے۔

(۱) ہمارا دستور ہماری پشت پر ہے‘ اس لیے کہ اس میں نہ صرف یہ کہ اللہ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرنے کا اعلان ہے‘ بلکہ دستور کی دفعہ ۲۲۷ کے مطابق ملک میں قرآن وسنت سے متصادم کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکتی‘ جبکہ عملاً پورا نظام اللہ کی حاکمیت سے بغاوت پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اللہ کی حاکمیت کے نظام کے لیے بھرپور احتجاجی تحریک چلانا ہمارا دستوری حق ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ دستور کی دھجیاں وہ بکھیر رہے ہیں جو اسلامی نظام

کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

(۲) مسالک کے اختلاف کے باوجود ایک متفقہ دستوری دستاویز پر ملک میں موجود تمام مسالک کے چوٹی کے علماء و زعماء ۱۹۴۹ء میں متفق ہونے کا ثبوت پیش کر چکے ہیں ''۳۱ علماء کے ۲۲ نکات'' کی صورت میں۔

(۳) ملکی قوانین کے حوالے سے مسلکی اختلافات کا issue بھی ہمارے ملک میں نہایت خوش اسلوبی سے طے ہو چکا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا ادارہ ۱۹۶۲ء سے سرگرم عمل ہے اور وہ اپنا اصل کام یعنی ریاست کو چلانے کے حوالے سے انگریز کے بنائے ہوئے باطل قوانین کی جگہ متبادل اسلامی قوانین تجویز کرنا آج سے کم و بیش ۲۰ سال پہلے مکمل کر چکا ہے۔ اس کے بعد تو محض سیاسی مفادات کی خاطر اس ادارے کو استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

اس کونسل کا خاص معاملہ یہ تھا کہ اس میں پاکستان میں موجود تمام مسالک کے اصحابِ علم وفضل کی نمائندگی شامل ہے۔ اور نہایت خوش آئند بات یہ ہے کہ اس کونسل کی سفارشات کو ملک کے تمام مذہبی مسالک کے نمائندہ اہل علم کا اتفاق حاصل ہے۔ یہ ادارہ ایک آئینی ادارہ ہے۔ آئین کے مطابق اس کی سفارشات کا قومی اسمبلی میں پیش کیا جانا اور پھر منظوری کی صورت میں اسی کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کرنا قومی اسمبلی کی بنیادی دستوری ذمہ داری ہے۔ لیکن افسوس کہ اس ذمہ داری سے آج تک مجرمانہ غفلت برتی گئی ہے اور کونسل کی طرف سے پیش کردہ ہزاروں سفارشات آج کباڑ خانے کی زینت ہیں۔ کونسل کی ان سفارشات کے مطابق قانون سازی کرنے کے نتیجے میں تمام ملکی و ریاستی قوانین بسہولت اسلامی سانچے میں ڈھالے جاسکتے ہیں اور اس طرح نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے قیام کی راہ ہموار ہوسکتی ہے —— گویا ؎

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز!
جس نے پھر بھی کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان؟

اسلامی نظام کے قیام کے عظیم مقصد

کے نقطۂ نظر سے

انتخابی کشمکش اور انقلابی جدّوجُہد

کا تقابلی مطالعہ اور میزانیہ نفع و نقصان

تنظیم اسلامی پاکستان، سلطنتِ خداداد پاکستان کی بقا اور سالمیت کے لیے دستور اور قانون کی بالادستی اور جمہوری، سیاسی اور انتخابی عمل کے تسلسل کو لازم اور ناگزیر سمجھتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کی بھی شدت سے قائل ہے کہ یہاں اسلامی نظام کا قیام انتخابات کے ذریعے ممکن نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے منکرات و فواحش اور ظلم و استحصال کے خلاف ایک منظم مطالباتی اور مظاہراتی جدوجہد لازمی ہے، جس میں وہ لوگ اپنی جان و مال کا نذرانہ پیش کر کے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں جو پہلے خود اپنی ذات اور اپنے دائرۂ اختیار کے اندر احکامِ شریعت کو نافذ کر چکے ہوں۔

''اسلامی نظام کے قیام کے عظیم مقصد کے نقطۂ نظر سے انتخابی کشمکش اور انقلابی جدوجہد کا تقابلی مطالعہ اور میزانیہ نفع نقصان'' کے عنوان سے بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا مرتب کردہ سہ ورقہ نومبر ۱۹۹۰ء کے میثاق میں شائع ہوا تھا، جس میں انتخابی سیاست اور انقلابی جدوجہد کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا۔ بعد ازاں اسے ہینڈ بل کی صورت میں طبع کروا کر کثیر تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ ۲۹ سال کے دوران یقیناً بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ چکا ہے اور حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں، تاہم اس کا موضوع تا حال زندہ ہے اور اس کی حقانیت آج بھی اتنی مسلّم ہے جتنی ۲۹ سال پہلے تھی، بلکہ بات مزید نکھر کر اور مبرہن ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ دعوت فکر اسلامی کے تحت یہ سہ ورقہ اس ترمیم کے ساتھ کہ ''چوالیس سالہ تاریخ کی گواہی'' کو ''۷۲ سالہ'' میں تبدیل کر دیا گیا ہے، قندِ مکرر کے طور پر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس آرزو کے ساتھ کہ ع ''شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات!''

انتخابی سیاست بمقابلہ انقلابی جدّوجُہد

اہداف وامکانات

- اصلاً حکومت چلانے والے ہاتھوں کی تبدیلی
- نظام میں صرف سطحی اور جزوی اصلاح کا امکان

- سماجی، سیاسی اور معاشی تمام سطحوں پر ظلم اور استحصال کا مکمل خاتمہ
- اسلام کے کامل نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام ونفاذ!

طریق کار اور لازمی تقاضے

- ساری بحث وقتی مسائل کے بارے میں
- اصل زور نعروں پر
- صرف اسلام پسندی پر اکتفا
- اصلاحِ عقائد غیر ضروری، بلکہ مضر
- تعمیرِ سیرت وقت کا ضیاع
- ڈھیلی ڈھالی رکنیت سازی
- ذاتی وجماعتی پبلسٹی اور نمود ونمائش
- سارا زور دنیوی بہبود اور اس کے ضمن میں آسمان اور زمین کے قلابے ملانے پر!
- علاقائی، گروہی اور طبقاتی مفادات کی دہائی!
- عوام سے ووٹوں کی بھیک مانگنا اور دھن، دھونس اور دھاندلی کا بھرپور استعمال

- ماضی، حال اور مستقبل کا گہرا شعور
- اصل توجہ سوچ کی تبدیلی پر
- احکامِ شریعت کی پابندی لازم
- تصحیح عقائد نہایت ضروری
- تعمیرِ سیرت کامیابی کی لازمی شرط
- سمع وطاعت پر مبنی مضبوط تنظیم
- للّٰہیت، اور نیکی کر دریا میں ڈال کا طرزِ عمل
- دنیا میں امن وچین اور عدل وانصاف کے ساتھ ساتھ اصل زور آخرت کی نجات پر!
- پوری نوعِ انسانی اور بالخصوص اُمتِ مُسلمہ کی خیر خواہی
- منکرات کے خلاف جہاد اور استحصالی ہتھکنڈوں کے خلاف پُرامن اور منظم مظاہرے!

کامیابی کے بنیادی لوازم

- محض عددی اکثریت، خواہ بے شعور بلکہ فاسق وفاجر لوگوں پر مشتمل ہو!
- عوام کی پسند وناپسند ہمیشہ مقدم!
- سکۂ رائج الوقت یعنی پیسہ، برادری، اور سرمایہ داری، جاگیرداری، قبائلی سرداری اور مزاروں کی سجادہ نشینی پر مبنی دنیوی وجاہت کی مناسب پذیرائی!
- رشوت، جوڑ توڑ اور ضمیر کے سودے

- تربیت یافتہ، منظم اور ایثار پیشہ لوگ خواہ قلیل اقلیت ہی میں ہوں
- ہر موقع پر صرف اللہ اور رسولؐ کی پسند وناپسند کا لحاظ!
- اصل اہمیت اور قدر ومنزلت کا معیار ایمان کی پختگی، اللہ اور رسول ﷺ کی سچی وفاداری، جانی ومالی قربانی اور جوشِ جہاد اور ذوقِ شہادت!
- اللہ کے ہاتھ جان اور مال کی ''بیع'' یعنی فروخت

- بے اصول اور انمل بے جوڑ اتحاد، جن میں قیادت کی رسہ کشی لازم!

- ایک امیر کی ''بیعت'' پر مبنی ''حزب اللہ'' کا قیام!

نتائج اور میزانیہ نفع ونقصان

- مذہبی جماعتوں کا باہمی تصادم، اور فرقہ واریت کا فروغ
- اسلام پسند ووٹروں کی تقسیم، اور الحادی قوتوں کی بالواسطہ تقویت اور ان کی کامیابی کا سبب!
- عوام الناس کی مذہبی جماعتوں سے بیزاری اور ملک وملّت کے مستقبل سے ناامیدی!

- ہر مکتب فکر کے مخلص، سرفروشوں، کے اتحاد سے فرقہ واریت کی نفی!
- انقلابی لوگ خود امیدوار نہ ہونے کے باعث ووٹوں کی تقسیم کے الزام سے بری اور انتخابات میں مذہبی جماعتوں کی بالواسطہ تقویت کا ذریعہ
- دین اور رجالِ دین پر عوامی اعتماد کی بحالی، اور اقامت دین کی جِدوجُہد میں شمولیت پر آمادگی

پاکستان کی بہتر سالہ تاریخ کی گواہی

- انتخابات کے میدان میں مذہبی عناصر ہمیشہ باہم متصادم —— اور مختلف سیکولر جماعتوں کا ضمیمہ بنے —— اور نتیجتاً غیر مؤثر رہے!
- اکثر وبیشتر طالع آزما اور اقتدار کے حریص لوگ ہی آگے آتے رہے —— اور معاشرے میں سرمایہ پرستی، کرپشن اور لوٹ کھسوٹ ہی کو فروغ حاصل ہوتا رہا۔

- مطالباتی اور مظاہراتی مہموں کی قیادت ہمیشہ رجالِ دین کے پاس رہی اور کامیابی نے بھی ہمیشہ قدم چومے (مثالیں: مطالبہ، قرارداد مقاصد، تحریکِ ختمِ نبوت ۱۹۷۳ء وغیرہ)
- مطالباتی اور مظاہراتی مہموں کے دوران مخلص اور ایثار پیشہ کارکنوں کے جوہر نمایاں ہوئے —— یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں انتخابی سیاست نے انہیں پھر پیچھے دھکیل دیا۔

حاصل کلام

- کم از کم اسلامی نظام کے قیام کے اعتبار سے انتخابی سیاست پر علامہ اقبال کی یہ پھبتی صد فیصد چسپاں ہوتی ہے کہ ؎

الیکشن، ممبری، کرسی، صدارت
بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

- کاش کہ جملہ مذہبی جماعتیں علامہ اقبال کے بقول ''اپنے عمل کا حساب'' کر سکیں، اور یہ جان لیں کہ اسلام کے مکمل نظام کا قیام انقلابی جدوجہد کا متقاضی ہے!

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب!

فاعتبروا یا اولی الابصار!

تنظیمِ اسلامی کا پیغام

نظامِ خلافت کا قیام

شجاع الدین شیخ☆

خطباتِ خلافت کے سلسلے میں آج ہماری گفتگو کا عنوان ہے: ''تنظیم اسلامی کا پیغام: نظامِ خلافت کا قیام'' ـــــ نظامِ خلافت کے قیام کی ذمہ داری ہم مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ فریضہ اکیلے اکیلے ادا نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے اجتماعیت اختیار کرنا ضروری ہے۔ اسی کی دعوت تنظیم اسلامی بھی آپ کے سامنے رکھتی ہے۔ تنظیم اسلامی کے لٹریچر میں آپ کو ایک چھوٹا سا سلوگن ملے گا: ''تنظیم اسلامی کا پیغام: نظامِ خلافت کا قیام''۔ اسی سلوگن کو آج کی نشست کا عنوان بنا کر میں نے یہ ارادہ کیا ہے کہ آپ کو تنظیم اسلامی کے حوالے سے چند باتیں بتائی جائیں۔

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ۱۹۷۵ء میں اس کی بنیاد رکھی۔ کن مقاصد اور کس طریقۂ کار کو سامنے رکھتے ہوئے اور کن ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے یہ اجتماعیت برپا کی گئی ہے' اور ان کے عملی پہلو کیا ہیں' اس کے حوالے سے آج گفتگو ہوگی۔

تنظیم اسلامی.....ایک تعارف

تنظیم اسلامی کے متعلق ایک پیراگراف ہے جو ہمارے لٹریچر میں عام ملے گا' اسے میں آپ کو پڑھ کر سناتا ہوں:

> ''تنظیم اسلامی مروجہ مفہوم کے اعتبار سے نہ کوئی سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ بلکہ ایک اسلامی انقلابی جماعت ہے جو اولاً پاکستان میں اور بالآخر ساری دنیا میں دینِ حق

☆ معاون برائے مرکزی شعبہ تعلیم و تربیت' تنظیم اسلامی

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظِ دیگر نظامِ خلافت قائم کرنا چاہتی ہے۔''

پہلی بات یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے۔ مروّجہ معنوں میں سیاسی جماعتیں جن میں دینی جماعتیں بھی شامل ہیں اور جو یہ سمجھتی ہیں کہ انتخابی راستے سے ملک میں اسلام آسکتا ہے' ہم ان کے اس موقف سے پوری دیانتداری کے ساتھ اختلافِ رائے رکھتے ہیں۔ چنانچہ مروجہ معنوں میں تنظیم اسلامی کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ سیاست پر ہم بھی بات کرتے ہیں۔ نظامِ خلافت کے تحت جو سیاسی نظام قائم ہوگا اس کے خد وخال کیا ہوں گے' وہ ہم بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ کو امیر تنظیم اسلامی کے خطاباتِ جمعہ میں حالات حاضرہ کے اعتبار سے سیاست پر باتیں ملیں گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاست دین سے الگ نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے کہا تھا ع ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' چنانچہ سیاست ہمارے دین کا ایک جزو ہے۔ دین ہمارے لیے اس بارے میں بھی رہنمائی عطا کرتا ہے' لیکن ہم نے انتخابی سیاست کو دین کے نفاذ کے لیے مناسب نہیں سمجھا اس لیے ہم مروجہ معنوں میں سیاسی جماعت نہیں ہیں۔

اسی طرح تنظیم اسلامی کسی خاص مسلک کی نمائندہ جماعت بھی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں مسالک ہیں' مختلف گروہ ہیں' مختلف فرقے ہیں' مگر تنظیم اسلامی کسی خاص مسلک کی بنیاد پر قائم نہیں ہے جیسے ہمارے ہاں مسلک کی بنیاد پر دیگر جماعتیں موجود ہیں' مثلاً جمعیت علماءِ اسلام کی بنیاد دیوبندی فکر پر ہے اور جمعیت علماءِ پاکستان بریلوی مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔ مگر تنظیم اسلامی فرقوں اور مسالک سے ماوراء ہے اور اس میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ موجود ہیں۔ الحمدللہ ہماری تنظیم میں حنفی مسلمان بھی شامل ہیں اور اہلِ حدیث بھی' جو تنظیم میں رہتے ہوئے اپنے فقہی مسلک پر عمل کرتے ہیں۔ گویا ہمارے نزدیک اہلِ سنت والجماعت کے تمام مکاتبِ فکر قابلِ احترام ہیں اور الحمدللہ ہمارے ہاں یہ وسعت قلبی موجود ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تنظیم اسلامی ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت ہے۔ انقلاب کی تعریف دینی فرائض کا جامع تصور ہے جو آگے بیان کیا جائے گا۔ اسلام صرف چند عبادات' عقائد اور رسومات کی ادائیگی کے اہتمام تک محدود نہیں ہے۔ یہ مکمل نظام زندگی ہے جو زندگی کے جملہ امور کے لیے رہنمائی عطا کرتا ہے۔ تنظیم اسلامی ہمارے سامنے انقلابی دعوت رکھتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ اللہ کی حاکمیت ایک فرد کے وجود پر بھی نافذ ہو اور معاشرے' ریاست' حکومت اور پوری زمین پر بھی اللہ کا حکم نافذ ہو۔ یہ دین کا انقلابی تصور ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ تنظیم اسلامی اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا پر دین حق یعنی دین اسلام کو غالب کرنے اور نظامِ خلافت کو قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس کے پیش نظر اسلامی انقلاب برپا کرنے کی جدّوجُہد ہے۔ اولاً پاکستان میں اس لیے کہ ہر نبی اور رسول کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ جس علاقے میں مبعوث کیے گئے وہیں پر محنت کرتے تھے۔ جب وہ قوم اپنے رسول کی جان کے درپے ہو جاتی تو اللہ کی طرف سے ہجرت کا حکم آ جاتا۔ اس کی اعلیٰ ترین مثال رسول اللہ ﷺ کی سیرت مطہرہ ہے۔ مکہ مکرمہ میں آپ ﷺ تیرہ برس موجود رہے لیکن جب لوگ آپ کی جان کے درپے ہو گئے تو اللہ کی اجازت سے آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ جب تک صلح حدیبیہ نہیں ہو گئی آپ ﷺ نے باہر وفود روانہ نہیں فرمائے۔ صلح حدیبیہ ۸ھ میں ہوئی اور اس کے آپ ﷺ نے بیرون عرب وفود روانہ فرمائے۔ اس کے بعد فتح مکہ ہوئی اور سرزمین عرب پر اللہ کا دین غالب ہوا کیونکہ مکہ کی حیثیت اُمّ القریٰ کی تھی۔ اس سے ہم نے طے کیا کہ اولاً پاکستان میں نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد کرنی ہے۔ خلافت کے خاتمے کے بعد مسلم ممالک کی ۵۷، ۵۸ لکیریں کھنچ گئی ہیں اور ان میں سے ہر ایک ملک میں داخلے کے لیے پاسپورٹ اور ویزے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارا اپنا ملک پاکستان ہے اور ہمارے لیے اولاً میدان یہی ہے۔ گو ساری زمین اللہ کی ہے اور ساری دنیا میں رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا دین پہنچنا چاہیے، لیکن یہ اگلا مرحلہ ہے۔

تنظیم اسلامی کے حوالے سے اکثر بنیادی باتیں آپ کے سامنے آ جانی چاہئیں کہ ہم آپ کو تنظیم اسلامی کی دعوت کیوں دے رہے ہیں اور کیوں یہ سارے تصورات آپ کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ ایک واضح وجہ تو یہی ہے کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ ہم نے پوری دیانت داری کے ساتھ اس جماعت کو اپنے لیے پسند کیا تو ہم یہ پسند کریں گے کہ اس خیر کو آپ تک بھی پہنچائیں۔ آپ کو اگر یہ بات پسند ہے تو آپ آگے بڑھیں، ہمارے دست و بازو بنیں۔ اگر آپ کا دل کسی اور جماعت پر مطمئن ہے اور آپ محسوس کریں کہ اس جماعت کے ساتھ وابستہ ہو کر میں اپنے دین کے تقاضوں پر عمل کر سکتا ہوں اور نظامِ خلافت کو قائم کرنے کی ذمہ داری کو میں وہاں احسن طریقے سے ادا کر سکتا ہوں تو اس جماعت سے وابستہ ہو جائیں۔ دین کے فرائض کو ادا کرنا لازم ہے جس کی ادائیگی کے لیے اجتماعیت ضروری ہے، اکیلے اکیلے یہ کام نہیں ہو سکتا۔

ہمارے بنیادی دینی فرائض

تین مختصر جملوں میں دینی فرائض کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے ہم خود اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنے کی کوشش کریں۔ دوسرا یہ کہ ہم دوسروں تک دین کی دعوت کو پہنچانے کی کوشش کریں۔ تیسرا یہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ادا کردہ دین حق کو غالب اور نافذ کرنے کی جدوجہد کریں اور نظام خلافت کو قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ یہ ہمارے بنیادی دینی فرائض ہیں اور یہی فرائض خواتین پر بھی عائد ہوتے ہیں مگر ان کے دائرۂ کار کے حدود میں رہتے ہوئے۔ مثلاً نماز مسلمان مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے، لیکن مرد کے لیے جماعت کی افضلیت ہے، چنانچہ مرد حضرات باجماعت نماز کی عادت بنائیں اور عورت کے لیے نماز کی ادائیگی گھر میں افضل ہے تو وہ گھر پر نماز ادا کریں۔ دائرۂ کار کے اعتبار سے یہ فرق واقع ہو گیا۔ ایسے ہی دیگر فرائض میں بھی دائرۂ کار کے اعتبار سے مرد و عورت میں فرق ہو جائے گا۔ معاملہ گڈمڈ نہیں ہونا چاہیے جیسے کہ ہم بعض جماعتوں میں دیکھتے ہیں۔ مغرب نے مرد و عورت کو شانہ بشانہ کھڑا کر دیا تو ہم بھی وہی کرنے لگے ہیں۔ عورتیں بھی مَردوں کے شانہ بشانہ گھر سے باہر آ کر دین کا کام کریں تو یہ ہمارے دین کا مزاج نہیں ہے۔

اللہ کی بندگی اختیار کرنا

اب آیئے ان تینوں فرائض کیلئے قرآن سے دلائل تلاش کریں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الذاریات، آیت ۵۶ میں فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنّوں اور انسانوں کو مگر صرف اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں''۔ شیخ سعدیؒ نے اس مفہوم کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

دین کے تقاضے کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ''عبادت'' ہے۔ عربی میں عبد غلام کو کہا جاتا ہے اور غلام چوبیس گھنٹے کا ملازم ہوتا ہے۔ وہ اپنے مالک کی مرضی کا تابع ہے۔

کسی نے کہا کہ آج کی دنیا میں تہذیبوں کا تصادم ہے۔ دراصل تصادم اس بات میں ہے کہ انسانی عقل بالاتر ہے یا رب العالمین کا حکم اور ہم خود کفیل ہیں یا وحی الٰہی کے محتاج۔ کچھ دن پہلے ہمارے ہاں میں بھی ہم جنس پرستوں کی محفل کا انعقاد ہو گیا۔ اس محفل میں ۷۵ سے زیادہ پاکستانی شریک تھے۔ کہنے والوں نے کہا کہ ہم عقل کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ یہ اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ ہے بلکہ ہر دور میں یہ مسئلہ رہا ہے۔ شیطان نے رب کے حکم کے مقابلے میں اپنی عقل

کو استعمال کیا۔ کہنے لگا کہ میں آگ سے بنا اور یہ مٹی سے‘ آگ اوپر جاتی ہے اور مٹی نیچے پڑی رہتی ہے‘ چنانچہ میں اسے سجدہ کیوں کروں۔ یہ ہے عقل پرستی کا فریب جو آج ہمارے معاشرے میں معروف ہے۔ یہی سب سے بڑا جھگڑا ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ میری چلے گی لیکن بندہ کہتا ہے کہ میری چلے گی۔

اللہ کی غلامی اور بندوں کی غلامی کے اعتبار سے ایک فرق ہو جائے گا۔ غلام بیچارہ مجبوراً غلام ہوتا ہے۔ اگر اسے کبھی بھاگنے کا موقع ملے تو چوکتا نہیں۔ کیا ہم مجبوراً اللہ کی عبادت کریں؟ وہ تو ہمارا مالک‘ خالق‘ رازق اور پالن ہار ہے۔ اپنی کروڑہا کروڑ مخلوق کا رازق ہے۔ چنانچہ محبت کے جذبے کے ساتھ سرشار ہو کر اللہ کی بندگی کرنی چاہیے۔ اللہ کی اطاعت کرنا عبادت ہے اور یہ عبادت چوبیس گھنٹے مطلوب ہے۔ بندے کے طرزِ عمل سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے عبادت میں ہے یا نہیں۔ جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن وہ ہے جس کو دیکھ کر اللہ یاد آ جائے۔ اب شادی کے موقع پر اس کے طور اطوار سے اور اس کے کاروباری انداز سے یعنی اذان کی آواز پر اس کے ردعمل سے پتا چل جائے گا کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔

کچھ معاملات تو ایسے ہیں جہاں ہمارا اختیار چلتا ہے۔ ایسے معاملات میں اللہ کی بندگی اختیار کی جائے تو ہو سکتی ہے۔ نماز روزے پر عمل کرنا مشکل نہیں۔ جو نماز روزے کو چھوڑ رہا ہے وہ جان بوجھ کر چھوڑ رہا ہے۔ کسی حکومت نے نماز کی ادائیگی پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ جو نماز چھوڑ رہا ہے وہ مجرم ہے۔ یہی قرآن سود کو چھوڑنے کا حکم دیتا ہے اور یہ سخت تنبیہہ کرتا ہے کہ اگر سود نہیں چھوڑتے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یہاں ہمارا اختیار نہیں ہے۔ سودی نظام کو ختم کر دینا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ یہ ہمارے بس میں ہے کہ سودی اکاؤنٹ نہ کھولیں اور سودی انوسٹمنٹ نہ کریں‘ لیکن سود کا غبار تو بہرحال ہمارے اندر جا رہا ہے۔ ہم جو غذا کھا رہے ہیں‘ جو پانی پی رہے ہیں اس میں سود لگ کر آ رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک ہمارا انفرادی دائرہ کار ہے اس میں اللہ کے حکم اور نبی اکرم ﷺ کے طریقے پر عمل ہو سکتا ہے‘ لیکن بہت سارے معاملات ایسے ہیں جہاں اللہ کے حکم پر عمل کرنا ہمارے بس میں نہیں رہا۔ اس کے نتیجے میں ہماری عبادت نامکمل ہے۔

دوسروں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دینا

اگلا مرحلہ دوسروں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دینا ہے۔ اگر میں اپنی عبادت کی تکمیل چاہتا

ہوں تو مجھے ماحول کو favourable بنانا ہوگا۔ میں نے مسجد میں نماز باجماعت ادا کی جس کے نتیجے میں الحمدللہ تقویٰ پیدا ہوا۔ مسجد سے باہر نکلتا ہوں تو بے حیائی کی دعوت عام بل بورڈز وغیرہ پر ملتی ہے۔ مجھے اس معاملے میں لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہیے تاکہ مسجد سے باہر نکل کر بھی میں اللہ کی بندگی کے قابل رہ سکوں۔ ہمیں اپنی عبادت کی تکمیل کے لیے دین کی دعوت اوروں کو دینی ہے۔ ہم رسول اللہ ﷺ کے امتی ہیں۔ اس ناطے ہمارا فرض ہے کہ اپنی اپنی استعداد کے اعتبار سے دین کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ امت اجتماعی سطح پر وہ کام کرے جس کے لیے اس کو برپا کیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران‘ آیت ۱۱۰ میں ارشاد ہوا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ ’’تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے تم حکم کرتے ہو نیکی کا اور تم روکتے ہو بدی سے اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر‘‘ یعنی تمہیں صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی جینا ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ‘ آیت ۱۴۳ میں ارشاد ہوا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ ’’اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو‘‘۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مجمع سے گواہی لی ہے: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) لوگو سنو! کیا میں نے پہنچا دیا؟ اس پر پورے مجمع نے یک زبان ہو کر جواب دیا: نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ۔ کہ ہاں ہم گواہ ہیں آپ ﷺ نے رسالت کا حق ادا کر دیا‘ آپؐ نے امانت کا حق ادا کر دیا (یہ قرآن آپؐ کے پاس اللہ کی امانت تھی جو آپؐ نے ہم تک پہنچا دی)‘ آپؐ نے اُمت کی خیرخواہی کا حق ادا کر دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے اللہ کو گواہ بناتے ہوئے تین فرمایا ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ)) ’’اے اللہ! تو گواہ رہ‘‘۔ پھر آپ ﷺ نے امت کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) ’’پس اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں ان تک جو موجود نہیں ہیں‘‘۔ چنانچہ اب یہ اُمت کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دیں۔

نبی اکرم ﷺ کے اُمتی ہونے کے ناطے امت کی دوہری ذمہ داری ہے کہ خود ممکنہ حد تک اللہ کی بندگی اختیار کریں اور اسی بندگی کی دعوت دوسروں تک پہنچائیں۔ لیکن اگر امت سوگئی ہو تو جنہیں احساس ہو وہ کھڑے ہوں اور ایک اجتماعیت اختیار کریں اور اجتماعی سطح پر اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش کریں۔ سورۂ آلِ عمران‘ آیت ۱۰۴ میں فرمایا گیا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ

يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۴﴾ ''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے' نیکی کا حکم دیتی رہے اور بدی سے روکتی رہے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''——

خیر کا لفظ قرآن میں مال کے لیے بھی آتا ہے' بھلائی کے لیے بھی اور یہ لفظ خود قرآن کے لیے بھی آیا ہے۔ سورۃ النحل' آیت ۳۰ میں فرمایا: ﴿وَقِيۡلَ لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ ؕ قَالُوۡا خَيۡرًا ؕ﴾ ''اور (جب) پوچھا جاتا ہے اہل تقویٰ سے کہ یہ کیا نازل کیا ہے تمہارے رب نے؟ وہ کہتے ہیں بھلائی''۔ اسی طرح سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۳ میں قرآن کے ساتھ جڑنے کا حکم دیا گیا ہے: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۪﴾ ''اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو مل جل کر اور تفرقے میں نہ پڑو''

سورۂ آلِ عمران کی مذکورہ آیت میں فرمایا گیا کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے۔ گویا امت اگر سوگئی ہو تو جن لوگوں میں احساس' تڑپ' جستجو ہو وہ اکیلے نہ بیٹھیں' بلکہ کسی نہ کسی اجتماعیت کو اختیار کرنے کی کوشش کریں۔ اسی کو قرآن دو ٹوک انداز میں سورۃ العصر میں بیان کرتا ہے: ﴿وَالۡعَصۡرِ ۙ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِىۡ خُسۡرٍ ۙ﴿۲﴾﴾ ''زمانے کی قسم ہے۔ یقیناً انسان خسارے میں ہے''۔ اللہ کی طرف سے یہ بہت بڑی وارننگ ہے۔ اگلی آیت میں امید کی کرن دکھا دی گئی: ﴿اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾﴾ ''سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی''۔ حق یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی کے پیسے دبا دیے تو اسے دلانے کی کوشش کی جائے گی۔ کسی نے کسی کا حق مارا تو اسے سمجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ سب سے بڑا حق اللہ کا ہے۔ وہ خالق بھی ہے' رازق بھی ہے' مالک بھی ہے اور حاکم بھی ہے۔ اس کے منوانے کے لیے میدان میں آنا ہے۔ یہ سارے کام ہوں تو ان شاء اللہ ہم خسارے سے بچ سکیں گے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ پر نبوت کا دروازہ بند ہونے کے بعد اور آپ ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے ہم پر دوسروں تک اللہ کے دین کی دعوت کو پہنچانے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

دینِ حق کو غالب اور نافذ کرنے کی جدّوجُہد کرنا

فرائض دینی میں تیسرا مرحلہ ہے: نظامِ خلافت کے قیام کی کوشش کرنا' مسلمانوں میں

امامت اور اجتماعیت کو قائم کرنا یعنی مسلمانوں کا کوئی امام ہو' کوئی امیر ہو۔ ہماری عبادت نامکمل رہے گی اگر اللہ کا دین قائم نہیں ہوتا' اگر سود کے نظام کا خاتمہ' زکوٰۃ کی ادائیگی اور کفالت عامہ کا معاملہ' نماز کی اقامت کا معاملہ' شریعت کے احکامات کے تحت مقدمات کے فیصلے نہیں ہوتے۔ سورۃ المائدہ کی آیات ۴۴' ۴۵ اور ۴۷ میں واضح طور پر فرمادیا: ﴿وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۵﴾ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور جو اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں...... وہی تو ظالم ہیں...... وہی تو فاسق ہیں''۔ اللہ کی طرف سے کتنی سخت تنبیہ ہے' جبکہ ہمارے ہاں تو قانون انگریز کا چل رہا ہے اور دھڑلے سے شریعت کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ اس تناظر میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی تکمیل کے لیے اقامتِ دین کی جدوجہد کرنا ہم پر فرض ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارا نظام بہترین ہے' لیکن یہ دین کہیں نافذ بھی ہے؟ دعوت کی تکمیل کے لیے بھی ضروری ہے کہ نفاذِ اسلام کی جدوجہد کی جائے۔ قرآن ہمیں رہنمائی عطا فرماتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ کی ۲۳ برس کی محنت کا نقطۂ نظر یہی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے مقصد کو قرآن کریم کے تین مقامات میں بایں الفاظ فرمایا گیا: ﴿هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹) ''وہی تو ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر''۔

رسالت مآب ﷺ کی یہ ۲۳ برس کی سنت ہے جس کے دوران ۲۵۹ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جانیں پیش کی گئیں اور اس کے نتیجے میں حق آ گیا اور باطل مٹ گیا کیونکہ باطل ہے ہی مٹنے کے لیے۔ یہی آپ ﷺ کا مشن ہے۔ اسی کا تسلسل خلفائے راشدین ؓ کے دور میں بھی رہا۔ اس کے بعد دورِ زوال شروع ہوا تاآنکہ آج دین کی عمارت پورے طور پر منہدم ہوچکی ہے۔ اب اسے دوبارہ قائم کرنے کی ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر ہے۔ یہی حکم قرآن سورۃ الشوریٰ' آیت ۱۳ میں پانچ جلیل القدر رسولوں کا تذکرہ کرتے ہوئے دیتا ہے: ﴿اَنۡ اَقِيۡمُوا الدِّيۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ ؕ﴾ ''کہ قائم کرو دین کو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو''۔

اجتماعیت اور تنظیم کی ضرورت واہمیت

حاصل کلام یہ ہے کہ اپنی ذاتی زندگی میں ممکنہ حد تک اللہ رب العالمین کی بندگی کی کوشش کرنا' نبی اکرم ﷺ کے امتی ہونے کے ناطے اللہ کے دین کے پیغام کو بندوں تک پہنچانا اور اللہ

کی زمین پر اس کے عادلانہ نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنے کی ذمہ داری ہمارے کاندھوں پر ہے۔ تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے ان فرائض کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے اور ان کی ادائیگی کے لیے اجتماعیت سے جڑنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ جماعتی زندگی اختیار کیے بغیر ان فرائض کی ادائیگی ممکن نہیں ہے۔ انفرادی سطح پر بھی قرآن اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ جڑنے کی بات کرتا ہے۔ سورۃ التوبہ' آیت ۱۱۹ میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۱۱۹﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچے لوگوں کی معیت اختیار کرو''۔ انفرادی سطح پر اللہ کی نافرمانی سے بچنا چاہتے ہو تو اجتماعیت اختیار کرو۔ اچھے ماحول میں جاؤ گے تو سیکھنے اور سمجھنے اور اصلاح کے مواقع ملیں گے اور اللہ کی بندگی آسان ہو جائے گی۔ دعوت کا فریضہ انجام دینا چاہتے ہو تو اجتماعیت کے ساتھ جڑو جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۴ پہلے گزر چکی کہ چاہئے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو خیر کی طرف دعوت دے' بھلائی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔ اس سے آگے بڑھیں۔ نفاذِ دین کے دوران قتال کا موقع بھی آ سکتا ہے۔ سورۃ الصّف' آیت ۴ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾ ''اللہ کو تو محبوب ہیں وہ بندے جو اُس کی راہ میں صفیں باندھ کر قتال کرتے ہیں' جیسے کہ وہ سیسہ پلائی دیوار ہوں''۔ اس کے علاوہ اجتماعیت کے لیے اور بھی بہت سارے دلائل دیے جا سکتے ہیں۔

احادیث مبارکہ کی جانب آئیں تو رسول اللہ ﷺ کی کئی احادیث ہیں جن میں اجتماعیت کو اختیار کرنے کا کہا گیا ہے۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اجتماعیت اختیار کرو اور اکیلے اکیلے رہنے سے بچو اس لیے کہ شیطان اس انسان سے زیادہ قریب ہوتا ہے جو کسی اجتماعیت سے جڑا ہوا نہ ہو۔ اور ایک روایت میں یوں بھی آیا کہ شیطان انسان کے لیے اس بھیڑیے کی مانند ہے جو اس بکری پر حملہ کرتا ہے جو ریوڑ سے علیحدہ چل رہی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو بھی اجتماعیت اختیار کرنے کا حکم فرمایا:

((اَنَا آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ' اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ :بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))(۱)

مسلمانو! میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان (باتوں) کا حکم دیا ہے:

(۱) مسند احمد' کتاب مسند الشامیین' باب حدیث الحارث الاشعری عن النبی ﷺ۔

التزامِ جماعت کا (حکم)' سننے کا (حکم)' ماننے کا (حکم)' ہجرت (راہِ خدا میں ترکِ وطن) کا اور اللہ کی راہ میں جہاد کا (حکم)۔''

سنن نسائی کی ایک روایت کے مطابق ہجرت یہ ہے کہ ہر وہ بات جو اللہ کو ناپسند ہو اسے چھوڑ دو۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ اللہ کے دین کی خاطر گھر بار بھی چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دو۔ جہاد کے آغاز کے بارے میں فرمایا کہ تم اپنے نفس سے جہاد کرو اللہ کی اطاعت کے لیے اور اس کی انتہا قتال فی سبیل اللہ ہے جس کا حاصل فتنہ کا خاتمہ اور اللہ کے دین کا غلبہ ہے۔ سورۃ الانفال' آیت ۳۹ میں فرمایا گیا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (کفر) باقی نہ رہے اور دین کل کا کل اللہ ہی کا ہو جائے۔''

اسلام کا مزاج ہی جماعتی ہے۔ مَردوں پر نماز باجماعت لازم ہے۔ نہ جمعہ اور نہ ہی عیدین کی نمازیں اکیلے پڑھی جا سکتی ہیں۔ سفر میں اگر تین افراد بھی جا رہے ہوں تو ان میں سے ایک ان کا امیر ہونا چاہیے۔ جماعتی زندگی کی اہمیت اور ''جماعت'' کے ڈسپلن سے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان بھی بہت واضح ہے:

اِنَّهٗ لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَةٍ وَلَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِاِمَارَةٍ وَلَا اِمَارَةَ اِلَّا بِطَاعَةٍ (۲)

''یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام نہیں ہے بغیر جماعت کے' اور کوئی جماعت نہیں ہے بغیر امارت کے' اور امارت کا کوئی فائدہ نہیں اگر اس کے ساتھ اطاعت نہ ہو۔''

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن وسنت میں ہمیں اجتماعیت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دینی فرائض کی جن تین سطحوں کو ہم نے سمجھا ان کی ادائیگی اجتماعیت اختیار کیے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ایک شخص اگر انفرادی سطح پر بہت عبادت گزار ہو بھی جائے' اپنی ذات میں انجمن بھی ہو جائے' بہت بڑا داعی دین بھی بن جائے' ایسا ممکن ہے لیکن دین کے نفاذ کے لیے اکیلے اکیلے جدوجہد ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک وقت میں دو دو پیغمبر (حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام) موجود رہے' لیکن قوم نے ان کو کورا جواب دیا۔ سورۃ المائدہ کی آیت ۲۴ میں قوم کا قول نقل کیا گیا ہے: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝۲۴﴾ ''بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور جا کر قتال کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں''۔ قوم کا یہ رویہ تھا تو اقامت دین کا کام نہ ہو سکا۔ حضرت محمد

(۲) سنن الدارمی' المقدمة' باب فی ذهاب العلم۔

مصطفیٰ ﷺ کے ساتھیوں نے کہا کہ ہمیں موسیٰؑ کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجئے۔ ہمیں حکم دیجئے‘ ہماری گردنیں حاضر ہیں۔ جہاں کہیں گے‘ ہم جائیں گے۔ پس اقامت دین کا کام مکمل ہوا۔

جماعت کی خصوصیات

مندرجہ بالا قرآنی آیات اور احادیث نبویہؐ سے یہ تو ثابت ہو گیا کہ اجتماعیت بہت ضروری ہے اور اس کے بغیر دین اسلام کے غالب اور نفاذ کی محنت کامیاب نہیں ہو سکتی تو اب آپ کسی بھی جماعت کے ساتھ مل کر دین کا کام کرنے میں آزاد ہیں۔ اگر آپ جماعت اسلامی کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں تو آگے بڑھئے۔ اگر آپ کسی اور جماعت کی تلاش میں ہیں یا کسی اور جماعت پر مطمئن ہو چکے ہیں تو اس میں شامل ہو جائیے۔

سوال یہ سامنے آتا ہے کہ وہ کیا معیارات ہیں کہ جس جماعت میں وہ موجود ہوں تو آپ اس میں شامل ہوں۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ پانچ بنیادی معیارات سامنے رکھ کر لوگوں کو دعوت دیا کرتے تھے۔ میں ان باتوں کو آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔

پہلی خصوصیت: پہلی اور بنیادی بات یہ ہے کہ جس جماعت میں ہم شمولیت اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ ایسی جماعت ہو جس کا واضح مقصد نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد ہو۔

دوسری خصوصیت: دوسری بات یہ ہے کہ اس جماعت میں یہ بھی تلاش کیجئے کہ اس میں شامل لوگوں کو دعوت اور ان کی تربیت کی بنیاد قرآن حکیم کو بنایا گیا ہو۔ اس حوالے سے قرآن میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۷ میں ارشاد ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ﴾ ’’اے رسول (ﷺ) پہنچا دیجیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ کی طرف آپؐ کے رب کی جانب سے۔ اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپؐ نے اُس کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا‘‘۔ یعنی تبلیغ قرآن حکیم کے ذریعے سے ہوگی۔ اسی طرح سورۂ ق کی آخری آیت میں فرمایا گیا کہ تذکیر بھی قرآن مجید ہی کے ذریعے سے ہوگی: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) آپ تذکیر کرتے رہیے اِس قرآن کے ذریعے سے ہر اُس شخص کو جو میری وعید سے ڈرتا ہے‘‘۔ سورۂ مریم کی آیت ۹۷ میں فرمایا: ﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا﴾ ’’تو ہم نے آسان کر دیا ہے اس (قرآن) کو آپؐ کی زبان میں تاکہ آپؐ بشارت دیں اس کے ساتھ متقین کو اور خبردار کریں اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو‘‘۔ اسی طرح مکی دور میں عقائد

کی درستگی اور ایمان پر استقامت وغیرہ جہاد کے ذریعے تھا اور اس جہاد کے لیے بھی رہنمائی قرآن سے حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے: ﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ’’تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان کفار کا کہنا نہ مانیے اور آپؐ ان کے ساتھ جہاد کریں اس (قرآن) کے ذریعے سے بڑا جہاد‘‘۔

اگر تربیت کی بات کریں تو رسول اللہ ﷺ کا معمول تو تھا ہی کہ تہائی‘ نصف اور دو تہائی رات قرآن حکیم کے ساتھ بسر فرماتے۔ تربیت کے اسی اصول کو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے اختیار فرمایا اور اسی قرآن سے ان کا تزکیہ فرمایا۔ چار مرتبہ یہ بات قرآن مجید میں دہرائی گئی کہ آپ ﷺ ان کو تلاوت‘ تزکیہ اور احکامات اور حکمت کی باتیں قرآن کے ذریعے بتائیں۔ مثلاً سورۂ آلِ عمران کی آیت ملاحظہ ہو:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾

’’بے شک اللہ نے احسان فرمایا ہے اہل ایمان پر کہ اٹھایا ان ہی میں سے ایک رسول‘ ان ہی میں کا‘ جو سناتا ہے انہیں اس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی‘ اگرچہ وہ تھے اس سے قبل کھلی گمراہی میں!‘‘

آپ ﷺ کے خطبات جمعہ کے بارے میں ابوداؤد کی روایت ہے کہ آپ خطبہ جمعہ میں قرآن حکیم پڑھتے اور اسی قرآن کے ذریعے سے لوگوں کی تذکیر فرماتے تھے۔ سردارانِ قریش سے جب آپ ﷺ کی گفتگو ہوتی تو انہیں بھی قرآن سناتے تھے۔ حتیٰ کہ طائف میں انسانوں نے سننے اور ماننے سے انکار کیا لیکن طائف سے واپسی پر رب کائنات نے جنات کو بھیج دیا اور قرآن نے اس بات کی گواہی دی کہ جنات نے نبی اکرم ﷺ سے قرآن سنا۔

بات تو واضح ہے لیکن یہ فتنوں کا دور ہے لہٰذا وضاحت ضروری ہے۔ ہم تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے قرآن پر بار بار زور دیتے ہیں تو ہم اسی قرآن کی بات کر رہے ہیں جس کی وضاحت صاحبِ قرآن محمد ﷺ نے فرمائی ہے۔ قرآن کی تعلیمات کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ سنتِ رسول ﷺ کو اور صحابہ کرام‘ تابعین اور تبع تابعین کے تعمل کو بھی دیکھا جائے گا کیونکہ قرآن کے نام پر قائم ہونے والی تحریکوں میں بڑے فتنے بھی پیدا ہوتے رہے ہیں۔

تیسری خصوصیت: تیسری بات یہ ہے کہ جس جماعت میں شمولیت اختیار کرنے کی

کوشش کریں‘ ہم دلائل کی بنیاد پر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بیعت سمع وطاعت فی المعروف کی بنیاد پر قائم ہو۔ ہمارے ہاں جس بیعت کا تصور معروف ہے وہ تصوف کے سلسلوں میں ہوا کرتی ہے۔ وہ افراد کے ذاتی تزکیے اور انفرادی اصلاح کے لیے ہوا کرتی ہے‘ لیکن جس بیعت کی ہم بات کرتے ہیں وہ بیعت محمدی ﷺ بھی ہے اور بیعت علی الموت اور بیعت علی الجہاد بھی ہے۔ یہ تصور ہمیں رسالت مآب ﷺ سے ملا۔ جس بیعت فی المعروف کی بات ہم کر رہے ہیں‘ وہ بیعت یہ ہے کہ جہاں امیر ہو وہاں اس کی بات کو سنا اور مانا جاتا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی ہر بات کو ماننا لازم تھا اور اب بھی لازم ہے۔ امام مالکؒ نے ایک مرتبہ روضۂ رسول ﷺ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ﷺ کے بعد کسی سے بھی اختلاف ہوسکتا ہے۔ اب جو بھی دینی جماعت کا امیر ہوگا اس سے بہرحال غلطی اور خطا کا امکان ہے۔ وہ اگر کوئی ایسا حکم دے جو خلافِ شریعت ہو تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ اسے بیعت اطاعت فی المعروف کہتے ہیں۔

بیعت کے سلسلے میں قرآن میں چار مقامات پر تذکرہ آیا۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ..... فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۭ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾ ’’یقیناً اللہ نے خرید لی ہیں اہلِ ایمان سے ان کی جانیں بھی اور ان کے مال بھی اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے..... پس خوشیاں مناؤ اپنی اس بیع پر جس کا سودا تم نے اس کے ساتھ کیا ہے۔ اور یہی ہے بڑی کامیابی‘‘۔ پھر بیعت کا ذکر سورۃ الفتح کی آیت ۱۰ اور ۱۸ میں بیعت رضوان کے حوالے سے آیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی موت کے بارے میں افواہ اڑا دی گئی تو چودہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت علی الموت کی تھی۔ قرآن گواہی دیتا ہے ان صحابہ کرامؓ سے اللہ راضی ہوگیا۔ خواتین کی بیعت کے الفاظ سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۲ میں آئے ہیں۔ سنن نسائی میں حضور ﷺ سے دس مختلف بیعتوں کا ذکر آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ہمیں بیعت کا نظام دے گئے۔ چنانچہ خلفائے راشدین کی خلافت بیعت کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ اس کے بعد جب بھی اسلامی تحریکیں چلیں خواہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا معاملہ ہو یا ماضی قریب میں تحریک شہیدین کا معاملہ‘ ساری تحریکیں بیعت کی بنیاد پر چلی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ بیعت کیے لیے رہنمائی ہمیں قرآن‘ سنت‘ احادیث‘ خلفائے راشدین اور امت کے تواتر عمل سے ملتی ہے۔ بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا ایک کتابچہ ہے جس کا عنوان ہے ’’اسلامی نظم جماعت میں بیعت کی اہمیت‘‘۔ اس ضمن میں اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔

چوتھی خصوصیت: چوتھی بات یہ ہے کہ اس جماعت کا طریقۂ کار ممکنہ حد تک نبی اکرم ﷺ کے اُسوہ کے انقلابی گوشے کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہو۔ ممکنہ حد تک سے مراد یہ ہے کہ مرورِ زمانہ کے نتیجے میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اس وقت ایک مشرک معاشرے میں یہ کام ہو رہا تھا اور آج ہمارے سامنے کلمہ گو مسلمان ہیں۔ ان سب حقائق کو پیش نظر رکھ کر اپنے طریقۂ کار کو ممکنہ حد تک نبی کریم ﷺ کے اسوہ کے مطابق بنانا ہے۔

پانچویں خصوصیت: پانچویں بات یہ ہے کہ جس جماعت میں شمولیت اختیار کرنی ہو اس کی قیادت کو دیکھیں۔ اس میں دنیاداری تو نہیں اور مشن سے وہ کتنا مخلص ہے؟

یہ پانچ باتیں ہیں جو کسی جماعت میں شمولیت سے پہلے پیش نظر رہنی چاہئے۔ میں پوری دیانت داری کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ ہم نے بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ سے یہ سیکھا کہ اگر تنظیم اپنے نظریات اور طریقۂ کار سے ہٹ جائے تو دوسری جماعت تلاش کر لینی چاہئے۔ چونکہ ہم نے دین کے لیے کام کرنا ہے تو کسی نہ کسی جماعت سے منسلک ہونا ضروری ہے۔ ہمارے لیے مشن اہم ہے‘ کوئی اجتماعیت نہیں۔ اگر کوئی انحراف نظر آئے تو اصلاح کی کوشش کریں گے۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت پر متمکن ہونے کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو تم پر میری پیروی لازم ہے لیکن اگر میں نے کج روی اختیار کی تو؟ لوگوں نے تلوار نکال لی اور کہا کہ ہم آپ کو سیدھا کر دیں گے۔ اگر تنظیم میں کوئی ایسی صورتحال پیدا ہوئی تو میں بھی اصلاح کی کوشش کروں گا بصورت دیگر کسی بہتر جماعت میں شمولیت اختیار کرلوں گا۔ مذکورہ معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی ہے۔ الحمدللہ ہم ان معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی ٹوٹی پھوٹی کوششوں کے ذریعے پیشرفت کی کوشش کر رہے ہیں۔

تنظیم اسلامی کی دعوت اور اس کے طریقۂ کار کو سمجھئے۔ اطمینان ہو تو اس میں شمولیت اختیار کیجئے۔ بصورت دیگر جس جماعت پر آپ کا دل ٹھک جائے اس میں شامل ہو جایئے۔ اگر کوئی جماعت آپ کی نظر میں نہیں جچتی تو خود جماعت قائم کرنے کی کوشش کیجئے۔ دین کا کام بہرحال کرنا ہے۔ یہ پیش نظر رہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائے اور اس راہ میں استقامت عطا فرمائے۔ آمین!! ۞ ۞ ۞

موجودہ حالات میں

اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ

از قلم: انجینئر نوید احمدؒ

الحمد للہ کہ اس وقت اُمّتِ مُسلمہ کی ایک قابلِ ذکر تعداد اسلام کو محض ''مذہب'' نہیں بلکہ ''دین'' سمجھتی ہے۔ ''مذہب'' انسان کی صرف انفرادی زندگی کے گوشوں یعنی عقائد' عبادات اور رسومات پر مشتمل ہے' جبکہ دین انفرادی زندگی کے ساتھ ساتھ انسان کی اجتماعی زندگی کے پہلوؤں یعنی سیاسی' معاشی اور معاشرتی معاملات کا احاطہ کرتا ہے۔ مزید برآں اب ایسے افراد کی بھی مناسب تعداد موجود ہے جو اسلام کے عطا کردہ نظامِ حیات کو غالب کرنے کی جدوجہد کو اپنا دینی فریضہ سمجھتی ہے۔ البتہ اسلامی انقلاب کے لیے طریق کار اور خاص طور پر اس کے آخری مرحلے کے بارے میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ انقلاب' انتخابات میں کامیابی حاصل کر کے برپا کیا جا سکتا ہے' بعض کے نزدیک یہ کام دعوت اور محض دعوت سے سرانجام دیا جا سکتا ہے اور کچھ اس کے لیے مسلّح جِدّوجُہد کو ضروری سمجھتے ہیں۔

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی کتاب ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' میں سیرتُ النبی ﷺ کے حوالہ سے اسلامی انقلاب کا طریق کار اور اس کے مختلف مراحل بیان کیے ہیں۔ اسلامی انقلاب کے ابتدائی مراحل کے بارے میں تو کوئی اختلافِ رائے موجود نہیں ہے' تاہم اس تحریر کے ذریعے اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے کی قدرے وضاحت پیشِ نظر ہے۔

اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ ''مسلّح تصادم''

اسلامی انقلاب کے آخری مرحلے کے لیے جب ہم قرآن حکیم' سُنّتِ نبویؐ اور تاریخِ انسانی پر غور اور منطق کی روشنی میں سوچ بچار کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ''انقلاب کا آخری مرحلہ مسلّح تصادم ہے''۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم' سُنّتِ نبویؐ' تاریخِ

انسانی اور منطق سے جو دلائل ہمیں ملتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

(۱) سورۃ الانفال (آیت ۳۹) میں اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾

''اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے۔''

اس آیت میں اہل ایمان کو اُس وقت تک لڑنے کا حکم دیا جا رہا ہے جب تک کہ کُل کا کُل نظامِ زندگی مکمل طور پر اللہ کے لیے نہ ہو جائے۔ گویا نظام کی تبدیلی کے لیے جنگ ناگزیر ہے۔

(۲) سورۃ الحدید (آیت ۲۵) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝۲۵﴾

''بے شک ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے ان کے ساتھ نازل کیں کتابیں اور ترازو تاکہ لوگ قائم ہوں عدل پر' اور ہم نے لوہا نازل کیا جس میں شدید جنگ (کی صلاحیت) ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے فائدے بھی ہیں اور تاکہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب میں رہتے ہوئے مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ قوت والا اور زبردست ہے۔''

اس آیت کا مضمون بھی از خود واضح ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کتابیں اور میزان یعنی نظامِ عدل انبیاءِ کرام علیہم السلام کو اس لیے عطا فرمایا کہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہوں۔ اس کے لیے ایسے طبقات کی اکثریت پر محض وعظ ونصیحت کارگر نہ ہوگی جو باطل نظام میں دوسروں کے حقوق غصب کر کے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ لہٰذا ان کے علاج کے لیے اللہ نے لوہا بھی اتارا ہے تاکہ ان سے جنگ کی جائے اور عدل وانصاف کے نظام کو بالفعل قائم کیا جائے۔

(۳) سورۃ الصّف (آیت ۹) میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اُس نے نبی کریم ﷺ کو بھیجا ہی اس مقصد کے لیے ہے کہ وہ کُل نظامِ زندگی پر دینِ حق کو غالب کریں۔ اسی سورۃ کی آیت ۴ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾

''بے شک اللہ محبت کرتا ہے ان لوگوں سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صف در

صف گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔‘‘

دینِ حق کو غالب کرنے کے لیے مسلّح تصادم ناگزیر ہے اور اللہ کو ایسے بندے پسند ہیں جو اس مقصد کے لیے مسلّح تصادم میں پامردی کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔

(۴) صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

’’رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے بعد اس کی امت میں اس کے حواریوں اور اصحاب نے اس کی سنت کو قائم نہ کیا ہو اور اس کے احکام کی پیروی نہ کی ہو۔ پھر ان کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جن کے قول اور فعل میں تضاد ہوتا ہے اور وہ ایسے کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا ہوتا۔ پس جو ان کے خلاف ہاتھ (قوت) سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے‘ جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے (یعنی دل میں انہیں برا سمجھے) وہ مؤمن ہے۔ اور اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں۔‘‘

اس حدیث میں اللہ اور اُس کے رسولوں کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف ہاتھ سے جہاد کو افضل ترین درجہ قرار دیا گیا ہے۔

(۵) نبی کریم ﷺ رحمتٌ للعالمین ہیں اور آپؐ ہرگز یہ پسند نہیں کر سکتے تھے کہ اللہ کے بندوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف پہنچے۔ لیکن ایسے ظالموں کا سر کچلنے کے لیے جنہوں نے نوعِ انسانی کو اپنا غلام بنا رکھا تھا‘ آپ ﷺ کو بھی دعوت سے آگے بڑھ کر تلوار ہاتھ میں لینی پڑی۔ اس راہ میں آپؐ کے انتہائی محبوب ساتھیوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا‘ خود آپؐ کو زخم بھی آئے اور آپؐ کے دندانِ مبارک بھی شہید ہوئے۔

(۶) ماضی قریب میں روس‘ فرانس اور ایران میں جزوی طور پر انقلاب آئے لیکن ان سب کے لیے انقلابیوں کو مسلح تصادم کی راہ سے گزرنا پڑا۔ ایران کا انقلاب اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہاں مسلح تصادم یکطرفہ تھا۔ حکومت نے عوام کو کچلنے کے لیے ہتھیار استعمال کیے لیکن عوام کی طرف سے احتجاج پرامن اور منظّم گھیراؤ کی صورت میں رہا۔

(۷) منطقی اعتبار سے بھی یہ بات واضح ہے کہ کوئی بھی طبقہ اپنے مفادات سے آسانی سے دستبردار نہیں ہوتا۔ ظالمانہ نظام میں ایک طبقہ ایسا ہوتا ہے جو بااختیار ہوتا ہے اور وہ

دوسروں کے حقوق غصب کر کے عیاشی کر رہا ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی تحریک اس ظلم کو ختم کرنے کے لیے اٹھتی ہے تو یہ طبقہ اسے کچلنے کے لیے پوری قوت صرف کرتا ہے اور یوں مسلّح تصادم کا مرحلہ ضرور آتا ہے۔

مسلّح تصادم کے لیے مشکلات

اب تک کی بحث سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ انقلاب کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہے۔ البتہ موجودہ حالات میں مسلح تصادم کی راہ میں دو ایسی مشکلات ہیں جو دورِ نبویؐ میں نہیں تھیں:

(۱) نبی کریم ﷺ کے زمانے میں باطل نظام کے چلانے والے اور محافظ کافر تھے‘ جو حضور ﷺ کے ساتھ تھا وہی مسلمان تھا اور جو بھی مخالف تھا وہ کافر تھا۔ جبکہ آج کے حالات میں تمام مسلمان ممالک میں جو بھی غلط نظام قائم ہے اس کے چلانے والے اور محافظ دونوں کلمہ گو مسلمان ہیں۔ ان میں سے بعض کو ان کے غلط کردار کی وجہ سے فاسق و فاجر تو کہا جا سکتا ہے لیکن دائرۂ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کلمہ گو مسلمانوں کے خلاف مسلّح جدّوجہد یعنی خروج کے لیے فقہاء نے جو سخت شرائط رکھی ہیں ان میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لیے جو افراد اٹھیں ان کی طاقت اور ان کے اثرات اتنے زیادہ ہو چکے ہوں کہ کامیابی یقینی نظر آ رہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تھوڑی سی طاقت کے ساتھ تصادم کا آغاز کر دیا جائے جس کا نتیجہ بدامنی اور ہلاکت کے سوا کچھ نہ نکلے۔ صاف ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں اس شرط کا پورا کرنا آسان نہیں ہے۔

(۲) حضور ﷺ کے زمانے میں جنگی مہارت اور ہتھیاروں کے اعتبار سے مسلمانوں اور کفار میں زیادہ فرق نہ ہوتا تھا۔ دونوں طرف لڑنے والوں کی جنگی مہارت یکساں ہوتی تھی اور ان کے ہتھیار بھی ایک جیسے تھے۔ گویا کمیت کا فرق تو تھا کیفیت کا فرق نہ تھا‘ جبکہ آج کے زمانے میں باطل نظام کی حفاظت کے لیے حکومت کے پاس ہر طرح کے وسائل اور لاکھوں کی تعداد میں ایسی ہمہ وقت فوجیں (Standing Armies) ہیں جو جنگ کے لحاظ سے پوری طرح تربیت یافتہ‘ منظّم اور جدید ترین اسلحہ سے لیس ہیں۔ دوسری طرف انقلاب کی جدوجہد کرنے والے عوام نہ اس طرح کی جنگی مہارت کے حامل ہیں اور نہ ہی جدید ہتھیار رکھتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ سے مسلح تصادم میں کامیابی تقریباً ناممکن نظر

آتی ہے۔ اس کی ایک واقعاتی مثال مالاکنڈ میں نفاذِ شریعت کی تحریک ہے۔ نفاذِ شریعت کے لیے تحریک کے مخلص کارکنوں نے ہتھیار اٹھائے لیکن حکومت نے علاقے کی ناکہ بندی کر کے جدید ہتھیاروں کے استعمال اور بعض علاقوں پر فضائی بمباری کے ذریعے سے تحریک کو کچل کے رکھ دیا۔

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ

''پُرامن اور غیر مسلح منظّم احتجاج''

اب تک کی گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱) اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ مسلح تصادم ہے۔

(۲) موجودہ حالات میں مسلح تصادم کا امکان یا اس کے ذریعے کامیابی قریباً ناممکن ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ کیا ہوگا؟ موجودہ حالات نے جہاں مسلح تصادم کے مرحلے کو قریباً ناممکن بنا دیا ہے وہیں ایک متبادل صورت بھی فراہم کر دی ہے۔ آج کے دور میں جو بھی جمہوری آزادی ہر ملک میں دی جاتی ہے اس کی بنا پر کسی غلط بات پر حکومت کے خلاف احتجاج کو شہریوں کا حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے ریاست کے خلاف بغاوت تصور نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا آج کے دور میں اسلامی انقلاب کا آخری مرحلہ پُرامن اور غیر مسلح منظّم احتجاج کے ذریعے طے کیا جا سکتا ہے۔ اس احتجاج میں کسی ایسے منکر کو لے کر اُٹھنا ضروری ہوگا جس کا خلافِ شرع ہونا تمام دینی طبقات کے نزدیک مسلم ہو۔ مثال کے طور پر ''سودی نظام'' وغیرہ۔ ایسے منکر کے خلاف اقدام ریاست کے اہم اداروں کا پُرامن گھیراؤ' دھرنا دے کر بیٹھنا یا سول نافرمانی کی تحریک ہو سکتا ہے۔ ان پرامن اور منظّم مظاہروں کے ذریعے سے حکومتِ وقت کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس منکر کا قلع قمع کرے اور اللہ کی حدود کو نافذ کرے۔

یہ طریقہ حکومت کے خلاف بغاوت کا نہیں اور نہ ہی قوم کو خانہ جنگی میں مبتلا کرنے کا ہے۔ اسی طرح اس طریقہ میں اقتدار کی طلب نہیں' بلکہ مسلمان حکمرانوں سے مسلم معاشرے میں دین کو نافذ کرنے کا مطالبہ ہے۔ اگر حکومت یہ مطالبہ نہیں مانتی تو پھر ہم میدان میں ہیں' گولیوں کے لیے ہمارے سینے کھلے ہیں اور لاٹھیوں کے لیے ہمارے سر حاضر ہیں۔ ہم قید و بند

کی آزمائش برداشت کرنے کو تیار ہیں' لیکن پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔ ہم ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسوہ پر عمل کریں گے جنہوں نے مکی دور میں ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں' لیکن جواب میں کوئی اقدام نہ کرتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹ کر صبر کا مظاہرہ کیا۔

آخری مرحلے کے آغاز کے لیے شرائط

البتہ اس طرح کے پُرامن احتجاج سے قبل ضروری ہے کہ:

(۱) انقلابی جماعت نے اپنے معاشرے میں دعوت کا حق ادا کیا ہو۔ بڑی وضاحت کے ساتھ اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کی فرضیت' اسلامی انقلاب کے برپا کرنے کی اہمیت اور اس کی برکات لوگوں کے سامنے پیش کی ہوں۔ ذہنوں میں اٹھنے والے سوالات و اعتراضات کے جوابات دیے ہوں۔

(۲) انقلابی جماعت میں شامل کارکنان نے اپنے اپنے دائرہ کار میں شریعت کے احکامات پر امکانی حد تک عمل کر کے سیرت و کردار کا لوہا منوایا ہو۔ عوام الناس ان کے قول و فعل کی درستی کے قائل ہوں۔ انہوں نے تزکیہ کے مراحل طے کیے ہوں' ان کا مطلوب و مقصود اللہ کی رضا کا حصول اور نجاتِ اخروی ہو اور ان کے دل راہِ حق میں جان دینے کے لیے بے چین ہوں۔

(۳) انقلابی جماعت ایک شخص کی قیادت میں حکم سننے اور ماننے کے اصول پر پوری طرح سے منظّم ہو' مختلف درجات پر تربیت یافتہ افراد نظم کے ذمہ دار ہوں اور تمام کارکنان نظم کے خوگر ہونے کا ثبوت دے چکے ہوں۔

دعوت' تنظیم اور تربیت کے مندرجہ بالا مراحل طے کر کے ہی انقلابی جماعت کو انقلاب کے آخری مرحلے یعنی میدان میں آ کر پرامن احتجاج کا آغاز کرنا چاہیے۔

آخری مرحلے کی اہم شرائط

انقلاب کے آخری مرحلے کے سلسلہ میں دو باتوں کا خاص اہتمام کرنا ہوگا:

(۱) احتجاج کا موضوع کسی ایسے منکر کے خلاف جدوجہد کو بنانا ہوگا جو مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ مثلاً عریانی و فحاشی کی ترویج' سود' جوا وغیرہ۔

(۲) اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ احتجاج مکمل طور پر پرامن ہو' یعنی اپنی طرف سے ہاتھ

بالکل نہ اٹھایا جائے‘ کسی قسم کی توڑ پھوڑ نہ کی جائے‘ کسی شے کو آگ نہ لگائی جائے۔ جس طرح مکی دور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہر قسم کے ظلم وتشدد کو پامردی سے برداشت کیا اور اپنی طرف سے جوابی کارروائی تو درکنار مدافعت تک نہیں کی‘ وہی طرزِ عمل اس اقدام یعنی مظاہروں‘ گھیراؤ وغیرہ کے معاملے میں اس انقلابی جماعت کو اختیار کرنا ہوگا۔ اگر کچھ شرپسند لوگ بدامنی پر اتر آئیں تو انقلابی جماعت کی تنظیمی طاقت اتنی مضبوط ہو کہ ان کو قابو کر کے حکومت کے حوالے کر دے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔

ماضی قریب میں اس طریق کار کی کامیابی کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں جماعت اسلامی نے اسی طریق کار کو اختیار کرتے ہوئے مطالبہ دستورِ اسلامی کی تحریک چلائی۔ چونکہ اس وقت تک جماعت اسلامی نے انتخابی سیاست کے میدان میں قدم نہیں رکھا تھا اس لیے دیگر دینی جماعتوں نے بھی اس تحریک کا بھرپور ساتھ دیا‘ چنانچہ تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے لیے اسی طریق کار کو اختیار کیا گیا اور کامیابی حاصل کی گئی۔ یاد رہے کہ اس تحریک کی قیادت ایک ایسی شخصیت کر رہی تھی جو معروف معنوں میں سیاسی نہیں تھی۔ ۱۹۸۰ء میں پاکستان میں اہلِ تشیع نے زکوٰۃ آرڈیننس کے تحت حکومت کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا اور آرڈیننس واپس لینے کا مطالبہ کیا۔ حکومت کے انکار پر انہوں نے اسلام آباد میں قصرِ صدارت کا پرامن گھیراؤ کیا اور مطالبہ کی منظوری تک دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ حکومت کو بالآخر گھٹنے ٹیکنے پڑے اور آرڈیننس میں ترمیم کرنی پڑی۔ ایران میں شاہ کے خلاف بھی اہل تشیع نے اسی انداز سے احتجاج کیا۔ فوج نے گولی چلائی اور ہزاروں مظاہرین مارے گئے لیکن احتجاج جاری رہا۔ آخر کار فوج نے اپنے ہی ملک کے عوام پر مزید گولیاں چلانے سے انکار کر دیا اور مظاہرین کو کامیابی حاصل ہوئی۔

ممکنہ نتائج

پُرامن اور منظم احتجاج کے تین ممکنہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں:

(۱) حکومت ان مظاہروں کے نتیجے میں پسپائی اختیار کرے اور منکرات کے خاتمے اور حدود اللہ کے نفاذ کا آغاز کر دے۔ اس طرح انقلابی جماعت ایک ایک منکر کو ختم کروا کر حدود اللہ کا نفاذ کرواتی رہے گی اور پورا نظام درست ہونے تک یہ جدوجہد جاری رہے گی۔

(۲) حکومت انقلابی تحریک کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لے اور اپنی بقاء اور مفادات کے تحفظ کے لیے تحریک کو مکمل طور پر کچلنے کا فیصلہ کرے۔ اس صورت میں حکومت پر قابض مراعات یافتہ طبقات یعنی سرمایہ دار اور جاگیردار ریاست کی پولیس اور فوج کو اس تحریک کو کچلنے کے لیے بے دریغ استعمال کریں گے۔ لاٹھیاں برسائی جائیں گی‘ آنسو گیس کے شیل پھینکے جائیں گے‘ گولیوں کی بوچھاڑ آئے گی اور گرفتاریاں ہوں گی۔ اگر لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں حتیٰ کہ جان دینے پر تیار ہوں اور ثابت قدمی سے میدان میں ڈٹے رہیں تو پولیس کتنوں کو گرفتار کرے گی اور کتنوں کو شہید کرے گی؟ بالآخر پولیس اور فوج جواب دے دے گی کہ یہ مظاہرین ہمارے ہی ہم مذہب اور ہم وطن ہیں‘ یہ کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے نفاذ کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے نکلے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکومت کا تختہ الٹ جائے گا اور انقلابی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ ان شاء اللہ العزیز! ماضی قریب میں اس کی ایک مثال موجود ہے۔ ۱۹۷۷ء میں نظامِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کے دوران پاکستانی فوج نے نہتے عوام پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس وقت چونکہ کوئی ایک منظم جماعت اقتدار سنبھالنے والی موجود نہ تھی لہٰذا فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

(۳) اگر حکومتِ وقت اس تحریک کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے‘ تو جن لوگوں نے اس راہ میں جانیں دی ہوں گی ان کی قربانیاں ہرگز ضائع نہیں ہوں گی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اجرِ عظیم اور فوزِ کبیر سے نوازے جائیں گے۔ (ان شاء اللہ!)

ہم نظام کو بالفعل بدلنے کے مکلّف یعنی ذمہ دار نہیں ہیں‘ البتہ اس کو بدلنے کی جدوجہد ہم پر فرض ہے۔ مزید برآں انہی جاں نثاروں اور سرفروشوں کے خون اور ہڈیوں کی کھاد سے ان شاء اللہ جلد یا بدیر کوئی نئی انقلابی اسلامی تحریک ابھرے گی جو طاغوتی‘ استحصالی اور جابرانہ نظام کو للکارے گی اور اس طرح وہ وقت آ کر رہے گا جس کی خبر الصادق والمصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ پورے کُرۂ ارضی پر اللہ کا دین اسی طرح غالب ہو کر رہے گا جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر غالب ہوا تھا۔

❁❁❁

تبلیغ کس لیے؟

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف
''دعوتِ دین اور اس کا طریقِ کار'' کا ایک اہم باب

جس سے بجا طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ خلافت کے ادارے کے قیام کے لیے تَن مَن دھن سے جِدّوجُہد کرنا ہر مسلمان کا اہم ترین دینی فریضہ ہے!

انبیاءؑ کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کے پہچاننے کی قابلیت اور نیکی کے اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی خواہش ودیعت کر دی ہے۔ اس پہلو سے انسان ایک اعلیٰ خلقت اور ایک بلند فطرت لے کر دنیا میں آیا ہے اور اس بات کا اہل ہے کہ اپنی سمجھ سے نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاں انعام کا مستحق ہو' اور اگر اپنی فطرت کے خلاف خیر کی جگہ شر کا راستہ اختیار کرے تو فاطر کی طرف سے اپنی اس خلافِ فطرت روش پر سزا پائے۔ لیکن اگر ایک طرف اس کی فطرت میں یہ پہلو خوبی اور کمال کا ہے تو دوسری طرف بعض اعتبارات میں خلا اور نقص بھی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نہ دنیا میں انسان کی ہدایت و ضلالت کے معاملہ کو تنہا اس کی فطرت پر چھوڑا نہ آخرت میں اس کو جزاء وسزا دینے کے لیے اس فطری رہنمائی کو کافی قرار دیا۔ بلکہ فطرت کے مقتضیات اور اس کی مخفی قابلیتوں کو آشکارا کرنے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرنے کے لیے اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا تاکہ قیامت کے دن لوگ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو نیکی اور سچائی کا راستہ معلوم نہیں تھا' اس وجہ سے وہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔ اس حقیقت کو قرآنِ مجید کی ان آیتوں میں واضح کیا گیا ہے:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾﴾ (النساء)

''(اللہ نے) رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکیم ہے۔''

﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰي فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَاۗءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۡ فَقَدْ جَاۗءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٩﴾﴾ (المائدۃ)

''اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول' رسولوں کے ایک وقفے کے بعد' تمہارے لیے دین کو واضح کرتا ہوا آ گیا ہے' مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا' ہوشیار کرنے والا تو آیا ہی نہیں۔ دیکھ لو ایک بشیر و نذیر تمہارے پاس آ گیا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

انبیاءؑ کے باب میں قانونِ الٰہی

اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے ہادی اور رسول بھیجے اور محض اس لیے کہ لوگوں پر حق پوری طرح آشکارا ہو جائے' کج روی اور گمراہی پر باقی رہنے کے لیے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ انبیاء کے بارے میں قانونِ الٰہی یہ رہا ہے کہ وہ سب کے سب بلا استثناء انسانوں میں سے آئے' فرشتوں یا جنّوں میں سے نہیں آئے' تاکہ انسانوں پر انسانی فطرت کے تقاضے انسانوں ہی کے ذریعہ سے واضح کیے جائیں اور لوگوں کے لیے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ انسان کے لیے کسی غیر انسان کا علم و عمل کیسے نمونہ کا کام دے سکتا ہے۔ اسی طرح بعض مستثنیٰ مثالوں کے سوا' ہر قوم کے اندر اللہ تعالیٰ نے اسی قوم کے اندر سے رسول بھیجے تاکہ قومی اجنبیت لوگوں کے لیے قبولِ حق میں مانع نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس' ہر قوم کے لوگوں پر اللہ کے رسولوں نے انہی کی زبان میں حق کی تبلیغ کی تاکہ لوگوں پر حق اچھی طرح واضح ہو سکے اور زبان بھی صاف ستھری' اینچ پینچ سے بالکل پاک اور سب کے فہم سے قریب تر اور دلنشین استعمال کی۔ پھر اللہ کے ان رسولوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ لوگوں کو ایک مرتبہ حق کی طرف پکار دیا ہو' بلکہ اپنی پوری پوری زندگیاں اسی مقصد میں لگا دیں اور جن باتوں کی دوسروں کو دعوت دی ان کو

خود بھی کر کے دکھا دیا اور ان کے ساتھیوں نے بھی اپنی عملی زندگی میں ان کا مظاہرہ کیا۔ یہ سارا اہتمام محض اس غرض کے لیے کیا گیا کہ خلق کو خالق کی رضا حاصل کرنے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو کچھ جاننا چاہیے اس کے بتانے میں کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہ جائے اور لوگ قیامت کے دن اپنی شرارتوں اور بدعملیوں کا الزام اللہ سبحانہٗ تعالیٰ پر نہ ڈال سکیں۔

خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت

جب تک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وہ وسائل نہیں پیدا کر لیے جو ساری دنیا کو ایک داعیٔ حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لیے ضروری تھے، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کا بھیجنا جاری رکھا۔ لیکن جب انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی و اجتماعی شعور اتنا بیدار ہو گیا کہ وہ ایک عالمگیر نظامِ عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائل اجتماع و تمدن نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغامِ ہدایت دنیا کے ہر گوشے میں بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء ''محمد'' رسول اللہ ﷺ کو بھیجے اور ان کے ذریعے سے لوگوں کو وہ مکمل نظامِ زندگی عنایت فرمائے جو تمام بنی نوعِ انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے بالکل مطابق ہو۔ یہی خدائی نظامِ زندگی ہے جس کو ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ اپنی روح کے اعتبار سے وہی دین ہے جس کو تمام انبیاءؑ لے کر آئے۔ صرف بعض اعتبارات سے یہ ان سے مختلف ہے۔ پہلے انبیاءؑ نے عقائد کی تعلیم اپنی قوموں کی استعداد کے لحاظ سے دی تھی، خاتم الانبیاء ﷺ نے عقائد کی تعلیم اس معیارِ فہم کے لحاظ سے دی جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کو عطا فرمایا ہے۔ دوسرے انبیاء نے جن قوانین کی تعلیم دی ان میں ان کی قوموں کے خاص مزاج اور ان کے خاص خاص امراض کی بھی رعایت تھی، لیکن اسلام کے قوانین میں کسی خاص قومی اور جماعتی مزاج و رجحان کے لحاظ کی بجائے صرف مزاجِ انسانی کا لحاظ ہے۔ دوسرے انبیاء کو جو نظامِ زندگی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا وہ صرف ان کی قوموں کی ضروریات کے اعتبار سے تھا، آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے جو نظامِ زندگی دنیا کو ملا وہ صرف کسی خاص قوم ہی کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا، بلکہ بنی نوعِ انسان کی تمام انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کے دو پہلو

آنحضرت ﷺ پر چونکہ تمام عالم کی ہدایت و رہنمائی اور تمام مخلوق پر اتمامِ حجت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور آپ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا: ایک بعثتِ خاص، دوسری بعثتِ عام۔

آپ ﷺ کی بعثتِ خاص اہلِ عرب کی طرف تھی اور اہلِ عرب کے ساتھ اسی خاص نسبت کی وجہ سے آپ کو نبی اُمّی یا نبی عربی کہا گیا اور آپ ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی اس کی زبان بھی عربی ہوئی۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں —— یعنی تبلیغ اور اتمامِ حجت —— آنحضرت ﷺ نے براہِ راست انجام دیں۔

آپ ﷺ کی بعثت عام تمام دنیا کی طرف ہے۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک اُمت عطا فرمائی اور اس اُمت کو یہ حکم دیا کہ رسول ﷺ نے جس دین کی تبلیغ تم پر کی ہے، اس کی تبلیغ اسی طرح تم دوسروں پر کرتے رہنا:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (البقرۃ ۲:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی اُمت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔''

﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ (الانعام ۶:۱۹)

''اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔''

دین کی حفاظت کے لیے دو خاص انتظام

آنحضرت ﷺ کی بعثتِ عام کے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک پوری اُمت کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے برپا کیا تاکہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر بولی میں یہ دعوتِ حق قیامت تک بلند ہوتی رہے اور دنیا الگ الگ نبیوں کی بعثت اور الگ الگ زبانوں میں وحی کے اُترنے کی ضرورت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہو جائے۔ چونکہ آپ ﷺ کے بعد اب کسی اور نبی کی بعثت ہونے والی نہیں تھی، خلق کی رہنمائی اور اتمامِ حجت کی پوری ذمہ داری ہمیشہ کے لیے آپ ﷺ کی

اُمت پر ڈال دی گئی تھی‘ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کو صحیح حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے دو خاص انتظام فرمائے۔ ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف وتبدیلی سے محفوظ فرما دیا تاکہ دنیا کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت معلوم کرنے کے لیے کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہ رہے۔

دوسرا یہ کہ اس اُمت کے اندر‘ جیسا کہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے‘ ہمیشہ کے لیے ایک گروہ کو حق پر قائم کر دیا‘ تاکہ جو لوگ حق کے طالب ہوں ان کے لیے ان کا علم وعمل شمع راہ کا کام دیتا رہے۔

اسی طرح کی ایک جماعت — اگرچہ اس کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو — اس امت میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ فتنوں کا کتنا ہی زور ہو‘ لیکن یہ صالح جماعت (۱) آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل کو زندہ رکھے گی۔ جب ضلالت کا اثر اس اُمت کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کر جائے گا جس طرح دیوانے کُتّے کے کاٹے ہوئے آدمی کے رگ وریشہ میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے‘ اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس اُمت کے ایک عضو کو اس زہر سے محفوظ رکھے گا۔ جب دنیا کا خمیر اتنا بگڑ جائے گا کہ معروف منکر بن جائے گا اور منکر معروف بن جائے گا اور اہلِ بدعت کا اتنا زور ہوگا کہ معروف کے ان داعیوں کی حیثیت دنیا میں اجنبیوں اور بیگانوں کی ہو جائے گی اُس وقت بھی یہ لوگ خلق کو معروف کی طرف پکارتے رہیں گے اور ہر قسم کی مخالفتوں کے باجود لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کریں گے۔ ہر دور میں اس طرح کی جماعت کو باقی رکھنے سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ جس طرح علم وحی کو قرآن کی صورت میں قیامت تک محفوظ کر دیا گیا ہے‘ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ اور رسول ﷺ کے صحابہؓ کے علم وعمل کو اس جماعت کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے اور خلق کی ہدایت اور رسول کی حجت تمام کرنے کے لیے جو روشنی مطلوب

(۱) یہاں ہمارا اشارہ ’’لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ قَائِمَةً بِاَمْرِ اللّٰهِ لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ اَوْ خَالَفَهُمْ، حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ ظَاهِرُوْنَ عَلَی النَّاسِ‘‘ (صحیح مسلم: کتاب الامارۃ‘ باب ۵۳) (رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گا‘ جو کوئی ان کو نقصان پہنچانا چاہے یا بگاڑنا چاہے تو وہ ایسا نہ کر پائے گا‘ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آن پہنچے‘ اور وہ لوگوں پر غالب رہیں گے۔‘‘) اور اس مفہوم کی ان متعدد روایات کی طرف ہے جو صحاح میں وارد ہیں اور جن کی صحت پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔

ہے وہ کبھی گُل نہ ہونے پائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں یہ لوگ پہاڑی کے چراغ ہوں گے جن سے راہ ڈھونڈنے والے رہنمائی حاصل کریں گے اور زمین کے نمک ہوں گے جن سے کوئی چیز نمکین کی جا سکے گی۔

تبلیغ بحیثیت ایک فریضۂ رسالت کے

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شہادت علی الناس یا تبلیغ دین محض بطور ایک نیکی اور دینداری کے کام کے مطلوب نہیں ہے اور نہ محض مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لیے مطلوب ہے‘ بلکہ آنحضرت ﷺ کی بعثتِ عام کا جو مقصد اس اُمت کے ہاتھوں پورا ہونا ہے‘ یہ اس کا مطالبہ ہے جو اللہ کے ہر اُس بندے کو ادا کرنا ہے جو آنحضرت ﷺ کی اُمت میں داخل ہے۔ یہ ایک فریضۂ رسالت ہے جو آنحضرت ﷺ کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر ڈالا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کریں گے تو وہ اس فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے جس کا بار اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر ڈالا ہے اور اس کوتاہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خیر اُمت کے اس منصب سے محروم کر دے جس پر اس فرض کی ادائیگی کے لیے ان کو سرفراز فرمایا ہے اور ساری دنیا کی گمراہی کا وبال ان کے سر آئے‘ کیونکہ آج خلق پر اتمامِ حجت کا ذریعہ یہی ہیں۔ اگر یہ اتمامِ حجت کے فرض کو ادا نہ کریں تو دنیا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی گمراہیوں کے لیے یہ عذر کر سکتی ہے کہ تو نے جن کو شہداء علی الناس بنایا تھا اور جن پر ہماری رہنمائی کی ذمہ داری ڈالی تھی انہوں نے ہمارے سامنے تیرے دین کی تبلیغ نہیں کی‘ ورنہ ہم ان ضلالتوں میں نہ پڑتے۔ اور مسلمان اس الزام کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

تبلیغ کے شرائط

شہادت علی الناس یا تبلیغ عام کی یہ ذمہ داری صرف اتنے سے ادا نہیں ہو سکتی کہ دنیا میں مسلمان نامی ایک گروہ موجود ہے خواہ وہ شہادت علی الناس کا یہ فرض انجام دے یا نہ دے‘ اور نہ ان اُلٹی سیدھی تدبیروں ہی سے ادا ہو سکتی ہے جن پر کتاب کے شروع میں ہم تنقید کر کے بتا چکے ہیں کہ ان تدبیروں سے نہ صرف یہ کہ دعوتِ حق کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا‘ بلکہ اُلٹا ان سے شدید نقصان پہنچا۔ یہ ایک نہایت اہم فریضۂ رسالت کی ادائیگی ہے‘ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو ان شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے جن شرائط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو انجام دینے کا

حکم دیا ہے اور جن شرائط کے ساتھ انبیائے کرام علیہم السلام نے اس کو انجام دیا ہے۔ یہاں ہم ان بعض شرطوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو اس فرض کی ادائیگی کے لیے ناگزیر ہیں۔

پہلی شرط: اس شہادت کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم جس دین حق کے شاہد ہیں، پہلے صدقِ دل کے ساتھ اس پر خود ایمان لائیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جس حق کی دعوت دیتے تھے پہلے اس پر خود ایمان لاتے تھے، اپنے آپ کو اس حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے:

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ﴾ (البقرۃ: ۲:۲۸۵)

''رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے ربّ کی جانب سے اُتاری گئی اور مؤمنین ایمان لائے۔''

اس حق پر ایمان لانے کے بعد جو چیزیں اس کے خلاف ہوئیں، خواہ وہ آباء و اَجداد کا دین ہو، خواہ قوم و قبیلہ کی عصبیت ہو، خواہ اپنا شخصی اور جماعتی مفاد ہو، سب سے دست بردار ہونے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا اور ان سارے خطرات میں، جو اس ایمان کے سبب سے پیش آئے ''اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ'' (الاعراف ۷:۱۴۳) (میں پہلا مؤمن ہوں) اور ''اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ'' (الانعام ۶:۱۶۳) (میں پہلا مسلم ہوں) کہتے ہوئے انہوں نے خود چھلانگ لگائی۔ یہ نہیں ہوا کہ خود تو اس سے کنارے پر کھڑے رہے، لیکن دوسروں کو للکارا کہ تمہاری نجات اگر ہے تو بس اس میں چھلانگ لگا دینے میں ہے۔

دوسری شرط: دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی جس حق پر ایمان لایا ہے اس کی زبان سے شہادت دے۔ جو شخص ایک حق پر ایمان لایا ہے اگر اس کو ظاہر کر سکنے کے باوجود ظاہر نہیں کرتا تو وہ 'گونگا شیطان' ہے اور قیامت کے دن اس پر حق چھپانے کا وہی جرم عائد ہوگا جو یہود پر عائد ہوا:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ (آل عمران ۳:۱۸۷)

''اور یاد کرو جب کہ اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی طرح ظاہر کرنا، اسے چھپانا مت۔''

اس معاملہ میں مصلحت بنی جو کچھ بھی ہونی چاہیے وہ دراصل حق کی خاطر ہونی چاہیے کہ اس کا اظہار صحیح طریق پر، صحیح محل میں، صحیح مخاطب کے سامنے ہو، تاکہ دعوتِ حق کا تخم بارآور ہو۔ اگر آدمی حق کو بالکل نظرانداز کر کے مجرد اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ایک امر حق کے اظہار سے

جی چراتا ہے یا اس سے غفلت برتتا ہے تو صرف بعض مستثنیٰ حالات ہی میں اس کی اجازت ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کی جان کے لیے کوئی واقعی خطرہ ہو اور اس امر کو محسوس کرتا ہو کہ اس وقت حق کی خدمت کے نقطۂ نظر سے بھی زیادہ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی جان بچا لے جائے۔ اس طرح کے کسی واقعی خطرہ کے بغیر اگر کوئی شخص اظہارِ حق سے جی چراتا ہے تو یا تو وہ منافق ہے یا کم از کم بے غیرت اور بے حمیت۔

تیسری شرط: تیسری شرط یہ ہے کہ یہ شہادت صرف قول ہی سے نہ دی جائے، بلکہ عمل سے بھی دی جائے۔ اسلام میں وہ شہادت معتبر نہیں ہے جس کے ساتھ عمل کی تائید و توثیق موجود نہ ہو۔ بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بسا اوقات قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا، فرمایا کہ یہ لوگ منافق اور جھوٹے ہیں اور اس کے ثبوت میں ان کے اعمال و اقوال کو ان کے سامنے رکھ دیا جن سے صاف اسلام اور مسلمانوں کی بدخواہی اور حق دشمنی نمایاں تھی۔ جو شخص ایک امر کو حق مانتا ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتا ہے اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کا عمل بھی اس کے موافق ہو، ورنہ وہ ان علمائے یہود کے نقشِ قدم کا پیرو ہے جن کو قرآنِ مجید نے ملامت کی ہے کہ تم دوسروں کو تو خدا کے ساتھ وفاداری کی دعوت دیتے ہو، لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ جس آدمی یا جس گروہ کا رویہ اس کی دعوت کے خلاف ہے وہ درحقیقت اپنی دعوت کی تردید کے دلائل خود پیش کرتا ہے۔ اور عمل کی دلیل چونکہ قول کی دلیل سے زیادہ قوی ہے اس وجہ سے خود اس کا رویہ اس کے دعویٰ کے خلاف ایسی حجت ہے کہ اس کے بعد اس کی تردید کے لیے کسی اور حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمان اگر اللہ کے دین کے شاہد ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس پر ایمان بھی لائیں، اس کی دعوت بھی دیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اس پر عمل بھی کریں، ورنہ اس شہادت کا حق ادا نہیں ہوسکتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا ہے۔ زندگی کے عملی معاملات میں اس دین سے منحرف رہنا اور زبان سے اس کے حق ہونے کی شہادت دینا خلق کے اوپر اتمامِ حجت کے نقطۂ نظر سے ایک بالکل ہی لغو حرکت ہے۔ ایسے بے عمل واعظوں کے وعظوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ اگر اپنی مخلوق کو مجرم ٹھہرائے تو یہ بات اس کے عدل کے خلاف ہوگی۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ

ضرور نکلے گا کہ خود مسلمانوں پر اس دین کی حجت پوری طرح تمام ہو جائے گی اور قیامت کے دن وہ اپنے ہی اقراروں پر پکڑے جائیں گے۔

عملی معاملات میں دین سے انحراف کی جو شکلیں قابل درگزر ہیں ان کو قرآنِ مجید نے خود بیان کر دیا ہے اور ساتھ ہی ان کا علاج بھی بتا دیا۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ جذبات یا شہوات کے غلبہ سے آدمی کا کوئی قدم حق کے خلاف اُٹھ جائے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فوراً توبہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی حق سے انحراف پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کی تلافی کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس چیز سے نکلنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اگر توبہ اور اصلاح کی جدوجہد کی بجائے آدمی اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنا لے اور جس حالت اضطرار میں گرفتار ہو گیا ہے اسی کو دین و مذہب قرار دے بیٹھے تو شہادت علی الناس کے جس منصب پر وہ مامور کیا گیا تھا' باطل پر اس کی قناعت نے اس سے اسے خود بخود ہٹا دیا۔

چوتھی شرط: چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ شہادت ہر قسم کی قومی و گروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر دی جائے' نہ کسی قوم کی دشمنی ہمیں اس حق سے منحرف کر سکے جس کے ہم داعی ہیں اور نہ کسی قوم کی حمایت و حمیت کا جذبہ اس سے ہمیں منحرف کر سکے۔ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں ہمیں جس طرح بے لاگ ہونا چاہیے' اس کی تعلیم قرآنِ مجید نے ان الفاظ میں دی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ﴾ (المائدۃ ۵:۸)

''اے ایمان والو! عدل کے علم بردار بنو' اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے' اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ اُبھارے کہ تم عدل نہ کرو۔''

اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کے مقابل میں جس طرح بے لوث ہونا چاہیے' اس کی تعلیم اس طرح دی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ﴾ (النساء ۴:۱۳۵)

''اے ایمان والو! حق پر جمے رہو' اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے' اگرچہ یہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات' تمہارے والدین اور تمہارے قرابت مندوں کے خلاف

ہی پڑے۔''

پانچویں شرط: پانچویں شرط یہ ہے کہ اس پورے حق کی شہادت دی جائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُترا ہے' کسی ملامت یا مخالفت کے اندیشہ سے اس میں سے کوئی چیز کم نہ کی جائے۔ جن چیزوں کی شہادت انفرادی زندگی کے فرائض میں ہے ان کی شہادت افراد اپنی انفرادی زندگیوں میں دیں۔ نماز ہر شخص پڑھے' روزہ ہر شخص رکھے' زکوٰۃ ہر صاحبِ مال دے' حج ہر صاحبِ استطاعت کرے۔ نیکی' دیانت داری' راست بازی اور پاک بازی کی زندگی ہر مسلمان اختیار کرے۔ البتہ جن چیزوں کی شہادت کے لیے اجتماعی زندگی شرط ہے اس کے لیے افراد کا فرض ہے کہ جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کریں اور جب وہ وجود میں آ جائے تو اس کی شہادت دیں۔ مثلاً معاشرت و معیشت کا اجتماعی نظام اور ملک کا سیاسی نظم و نسق افراد کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس کو اسلامی ڈھانچہ میں ڈھالنے کے لیے ایک جماعت کی قوت درکار ہے۔ اس وجہ سے اس سلسلہ میں سب سے مقدم ضرورت ایک صالح جماعت کے قیام کی ہے۔ اس جماعت کے قیام کے بعد اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں بھی اس حق کی شہادت واجب ہو جائے گی جو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف سے اُترا ہے۔

ذیل میں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ کس طرح نبی ﷺ کو پورے دین کی' بغیر کسی کمی بیشی کے' دعوت کی تاکید کی گئی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ﴾ (المائدۃ ۵:۶۷)

''اے رسول (ﷺ)! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اُتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو' اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔''

﴿الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ﴾ (الاحزاب ۳۳:۳۹)

''وہ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔''

﴿وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾
(الاحزاب ۳۳:۴۸)

''اور کافروں اور منافقوں کی بات کا دھیان نہ کرو' اور ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو' اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔''

﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ﴾ (الشوریٰ ۴۲:۱۵)

''پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اس پر جمے رہو' جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے' اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو۔ اور اعلان کر دو کہ اللہ نے جو کتاب اُتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔''

چھٹی شرط: چھٹی شرط یہ ہے کہ جب ضرورت داعی ہو' اللہ کے دین کی شہادت جان دے کر دی جائے۔ یہ شہادت کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے دین کو برپا کرنے کے لیے جہاد کیا اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کے حق ہونے کی گواہی تلواروں کی چھاؤں میں بھی دی' ان کو شہید کہا گیا ہے۔ اور غور کیجیے تو ان لوگوں کے سوا نہ اس لقب کا کوئی اور مستحق ہو سکتا ہے اور نہ اس لقب کے سوا کوئی اور لقب ان کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اس اُمت پر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو پورا کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی محنت کا اللہ کے ہاں اجر بھی پائے گا' لیکن جنہوں نے اس راہ میں اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیا اور اپنے سر دے کر اس حق کی گواہی دی' درحقیقت وہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان کو شہید کا لقب ملے' کیونکہ ایک چیز کے حق ہونے کی اس سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ آدمی اس کی حمایت و نصرت کی راہ میں اپنا سر کٹا دے۔ پس جو ہمت و ریہ بازی کھیل گیا اس نے وہ شہادت دے دی جس کے بعد شہادت کا کوئی اور درجہ باقی نہ رہا۔

مسلمانوں کا فرضِ منصبی

یہی فریضۂ رسالت ہے جس کی وجہ سے اس اُمت کو ''خیر اُمت'' کہا گیا ہے۔ اگر مسلمان اس فرضِ منصبی کو بھلا دیں تو یہ دنیا کی قوموں میں سے بس ایک قوم ہیں۔ نہ ان کے اندر کوئی خاص خوبی ہے' نہ کوئی خاص وجہ فضیلت' اور نہ پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پروا ہے کہ وہ دنیا میں عزت

کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلت کے ساتھ۔ بلکہ اس فرض کو فراموش کر دینے کے بعد وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں' جو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف سے کسی منصب پر سرفراز کی گئی تھیں' اپنا فرض انجام نہ دینے کی وجہ سے معتوب ہو گئیں۔ چنانچہ جس آیت میں مسلمانوں کے ''خیر اُمت'' ہونے کا ذکر ہے اسی میں ان کی ذمہ داری بھی واضح کر دی گئی ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ (آلِ عمران ۳:۱۱۰)

''تم بہترین اُمت ہو' لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو' معروف کا حکم دیتے ہو' منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

اسی جماعتی فرض کو ادا کرنے کی باضابطہ صورت خود اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی یہ ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴﴾ (آلِ عمران)

''اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے' معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے' اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک ٹھیک نبوت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ نیکی کی دعوت' معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا جو مسلمانوں نے اس لیے قائم کیا کہ اس جماعتی فرض کو انجام دے سکیں جو آنحضرت ﷺ کے بعد اس اُمت کو حق پر استوار رکھنے اور دنیا کو حق کی دعوت دینے کے لیے اس اُمت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اور اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور مسلمانوں سے باہر بھی انجام دیتا رہا' ہر مسلمان اس فرض سے سبکدوش رہا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس وقت تک تبلیغ کا فرض ایک فرضِ کفایہ تھا اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر جماعت کے تمام افراد کو اس فرض کی ذمہ داری سے عنداللہ بَری کر دیتا تھا۔ لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہو گیا تو جس طرح کسی ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے باشندوں کے جان و مال کی ذمہ داری خود ان کے اوپر منتقل ہو جاتی ہے اور جب تک وہ از سرِنو اپنے نظامِ سیاسی کو درست نہ

کرلیں ان میں سے ہر شخص اپنی حفاظت کا بوجھ خود اُٹھاتا ہے‘ اسی طرح نظامِ خلافت کے درہم برہم ہوجانے کے بعد اب یہ فریضۂ شہادت علی الناس اس اُمت کے تمام افراد پر منتقل ہوگیا ہے اور جب تک وہ اس کو انجام دینے کے لیے اس صالح اسلامی نظام کو قائم نہ کریں جس کا اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے حکم دیا ہے‘ اس وقت تک اس فریضہ کے ادا نہ ہونے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور قیامت کے دن اس کی پرسش ہر شخص سے ہوگی۔

خلاصۂ بحث

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے:

(ا) آنحضرت ﷺ پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لیے تبلیغ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی کریم ﷺ نے رہنمائی فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی اُمت کے سپرد فرمایا تاکہ یہ اُمت ہر ملک‘ ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

(ب) اس تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے‘ زبان سے کی جائے‘ عمل سے کی جائے۔ بلاتقسیم وتفریق‘ پورے دین کی کی جائے۔ بے خوفِ لومۃ لائم اور بے رورعایت کی جائے۔ اور اگر ضرورت داعی ہو تو جان دے کر کی جائے۔

(ج) اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت تھا‘ اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

(د) اس ادارہ کے منتشر ہوجانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری اُمت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہوگئی۔

(ہ) اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی ہیں: یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگائیں۔

(و) اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرضِ رسالت کو ادا نہ کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے‘ بلکہ خلقِ خدا کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لیے اصل محرک درحقیقت اس فرضِ عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور اس میں جو چیز بطورِ مطمحِ نظر اس وقت پیش نظر رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نظامِ دعوتِ خیر پھر وجود میں آجائے جو خلق کو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمامِ حجت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہے ہر مسلمان کا سب سے مقدم اور سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لیے جو کچھ کرسکتا ہے کرے۔ اسی کے لیے ہر مسلمان کو سونا اور جاگنا چاہیے‘ اسی کے لیے کھانا اور پینا چاہیے‘ اور اسی کے لیے مرنا اور جینا چاہیے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی خدا کی منشاء کے بالکل خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اپنی اس کوتاہی کے لیے کوئی عذر نہ کرسکیں گے۔ یہ چیز ان کی ہستی کی غایت ہے۔ اگر اس کو انہوں نے کھو دیا تو جس طرح وہ تمام چیزیں جو اپنے مقصدِ وجود کو کھو کر کوڑے کرکٹ میں شامل ہوجاتی ہیں اسی طرح یہ بھی اس زمین کے خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ’’اُمتِ وسط‘‘ یا ’’خیرِ اُمت‘‘ کے لقب کا مستحق سمجھیں یا اللہ سبحانہٗ تعالیٰ سے کسی نصرت وحمایت کی اُمید رکھیں۔ ❁❁❁

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

تنظیمِ اسلامی شمالی امریکہ
ماضی، حال اور مستقبل

از بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

بانی محترمؒ کا یہ فکر انگیز مضمون ۲۰۰۳ء کا تحریر کردہ ہے اور قبل ازیں میثاق (ستمبر ۲۰۰۳ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے دینی و تحریکی فکر کے تقاضے بیان کرتے ہوئے امریکی معاشرے میں دعوت و اقامتِ دین کے کام کی ممکنہ عملی صورتوں پر اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ اگرچہ اس دینی و تحریکی فکر کے دونوں رخ ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) اور گاڑی کے دو پہیوں کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن بانی محترمؒ کی زندگی بھر کی تقاریر اور تحریریں اس حوالے سے واضح اور غیر مبہم ہیں کہ اسلامی انقلاب برپا کرنے کی خواہش ان کے رگ و پے میں شامل تھی، لہٰذا تنظیم اسلامی ان کی ترجیح اول تھی اور علمی کام کی اصل اہمیت یہی تھی کہ رفقاءِ تنظیم کو علمی سطح پر بھی دلائل و براہین سے مسلح کیا جائے۔ تنظیم اسلامی کی ''دعوتِ فکرِ اسلامی مہم'' کے موقع پر یہ مضمون دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

تنظیم اسلامی شمالی امریکہ (T.I.N.A) کی حیثیت اس پودے یا درخت کی نہیں ہے جو کسی سرزمین سے اپنے ہی بیج کے پھوٹنے کے نتیجے میں پہلے دو پتیوں کی صورت میں ظہور کرتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ بڑھ کر مضبوط پودے یا توانا درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے، بلکہ اس کی حیثیت ان ''اضافی جڑوں'' (adventitious roots) کی سی ہے جو کسی بڑے درخت (جیسے برگد) کی شاخوں سے انسانی ڈاڑھی کے مانند نیچے اترتی ہیں اور پھر زمین میں اپنے پنجے گاڑ کر رفتہ رفتہ خود ایک مضبوط اضافی تنے کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

واضح رہے کہ ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی پاکستان سے علیحدگی اختیار کرنے اور پھر لگ بھگ آٹھ سال تک اِدھر اُدھر کی خاک چھاننے کے بعد میں نے اپنے آزادانہ مشن کا آغاز ۱۹۶۵ء میں لاہور میں درس قرآن کے حلقوں سے کیا۔ جن کے نتیجے میں ۱۹۷۲ء میں مرکزی

انجمن خدام القرآن لاہور قائم ہوئی۔ اور پھر اسی کی کوکھ سے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی نے جنم لیا —— جو ابتداء ہی سے ''عالمی'' تھی، یعنی اس کے ساتھ کسی ملک یعنی پاکستان کا لاحقہ لگا ہوا نہیں تھا، بلکہ یہ طے تھا کہ پوری دنیا میں کہیں بھی اور کوئی بھی مسلمان مرد یا خاتون اس میں شریک ہو سکتی ہے۔ (اگرچہ ۱۹۹۱ء میں جب میں نے تحریک خلافت کا آغاز کیا تو اس کے ساتھ پاکستان کا لفظ شامل تھا، یعنی تحریک خلافت پاکستان!)

تاہم چونکہ ابتداء ہی سے میرے ذہن میں یہ بات واضح تھی کہ انقلابی تحریک اپنا پورا زور کسی ایک ہی مقام پر لگایا کرتی ہے تاکہ وہاں مطلوبہ انقلاب برپا ہو جائے تو پھر اس کی ''تصدیر'' (export) دوسرے ممالک کو ہوتی ہے (بمقابلہ مشنری و تبلیغی تحریکوں کے جو اپنا دعوتی اور تبلیغی base بڑھاتی چلی جاتی ہیں، قطع نظر اس سے کہ اس کے نتیجے میں کہیں زندگی کے اجتماعی نظام میں کوئی عملی تبدیلی آتی ہے یا نہیں!) لہٰذا میرا پاکستان سے باہر کسی دعوتی یا تبلیغی سفر کا کوئی ارادہ یا منصوبہ نہیں تھا!

لیکن ۱۹۷۹ء میں امریکہ سے ایک زوردار دعوت موصول ہوئی تو میں نے خالص سیر اور کُرۂ ارضی کے دوسری جانب کی دنیا کو بالفعل اور بالمشافہ دیکھنے کے شوق میں اسے قبول کر لیا۔ ایک اضافی محرک یہ بھی تھا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اُن دنوں وہیں مقیم تھے اور میرے دل میں خواہش تھی کہ وہاں ان سے ملاقات کی کوشش کروں۔ (اس لیے کہ پاکستان میں اس کے لیے ''حیات کا ماحول سازگار'' نہیں تھا!)۔ وہاں میں نے پہلے بالٹی مور، واشنگٹن ایریا، پھر کینیڈا میں ٹورنٹو اور مانٹریال اور بالآخر بالکل اتفاقی طور پر شکاگو میں پاک و ہند اور عرب ممالک سے ''نو وارد'' (یعنی وہ لوگ جو ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں امریکہ منتقل ہوئے تھے) اعلیٰ تعلیم یافتہ اور خوشحال ہی نہیں مرفّہ الحال لوگوں میں جو مذہبی سرگرمی دیکھی اور اس کے ضمن میں حرکت و برکت کے جو مناظر سامنے آئے —— ان سے ایک جانب تو میں بہت متأثر ہوا، اس لیے کہ پاکستان میں اس قسم کی elite کلاس میں اس نوع کی مذہبی سرگرمی قطعاً مفقود تھی، دوسری جانب ایک حسرت پیدا ہوئی کہ کاش یہ لوگ پاکستان ہی میں رہتے اور وہاں اسلامی تحریک کے دست و بازو بنتے —— چنانچہ مجھے وہی صدمہ محسوس ہوا جو اس شعر میں سامنے آتا ہے کہ ؎

مگر وہ علم کے موتی ' کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا!

اور اس کے نتیجے میں دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ ان سب کو نہیں تو کچھ نہ کچھ لوگوں کو تو پاکستان کے لیے reclaim کیا ہی جائے! —— دوسری طرف وہاں کے لوگوں نے شدید اصرار کیا کہ آپ کو ہر سال لازماً امریکہ آنا چاہیے —— تو کچھ ان کی قوتِ جاذبہ اور کچھ اس بات کی بنا پر جو ابھی بیان ہوئی میرا ''ذوقِ انجذاب'' منتج ہوا اس پر کہ ۱۹۷۹ء سے سالانہ امریکہ یاترا کا جو سلسلہ شروع ہوا تو وہ ۲۰۰۱ء تک تو سوائے ایک سال کے ہر سال لازماً جاری رہا۔ جبکہ بعض سالوں میں دو دو سفر ہوئے اور ایک سال تو ایسا بھی آیا جس میں امریکہ کے تین سفر ہو گئے!

اس آغاز کے بعد سے اب تک تیئیس (۲۳) برس سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اور ظاہر ہے کہ جیسے جیسے وقت کے دریا میں پانی بہتا رہا' امریکہ میں میری involvement بھی بہت سے مراحل سے گزری اور اس میں امید اور مایوسی' نشیب و فراز اور کامیابیوں اور ناکامیوں کے متعدد مراحل آئے' تاہم اسے مشیت ایزدی ہی کا نتیجہ سمجھا جائے گا کہ وہاں کئی ups & downs کے باوجود ایک حرکت جاری رہی!

ابتداء کے چند سالوں کو تو honey moon اور romanticism کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہاں مجھے جو response ملا وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ انجمن خدام القرآن (Society of the Servants of Quran-"SSQ") تو ایک ہی سال میں قائم ہو گئی۔ تنظیم اسلامی کے قیام کے ضمن میں مَیں نے پہلے کوشش کی کہ چونکہ وہاں جماعت اسلامی سے ذہنی اور قلبی تعلق رکھنے والے لوگوں کا ایک حلقہ (Islamic Circle of North America) یعنی ICNA کے نام سے قائم تھا' اور ظاہر ہے کہ میرے فکر کی شاخ بھی بہت حد تک جماعت اسلامی کے فکری درخت ہی سے پھوٹی تھی' اور یہاں پاکستان میں میرا اصل اختلاف جماعت کی سیاسی پالیسی سے تھا جس کا وہاں کوئی امکان ہی نہ تھا' لہٰذا میں نے وہاں ICNA کی قیادت کو offer کی کہ اگر پاکستان میں پالیسی سے اختلاف سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آپ یہاں مجھے بھی اپنا بھائی اور رفیق سمجھیں تو میں علیحدہ تنظیم قائم نہ کروں —— لیکن ان حضرات نے میری اس پیشکش کو نامعلوم کس جذبے پر مبنی محمول کیا کہ جواب صاف نفی میں آ گیا۔ تب وہاں تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ بھی قائم کر دی گئی —— اور میرے لیے یہ امر بہت

حیران کن ثابت ہوا کہ پاکستان میں تو ''بیعت'' کا لفظ سن کر لوگ بدک جاتے تھے وہاں اسے پوری ذہنی و قلبی آمادگی کے ساتھ قبول کر لیا گیا۔

میں نے اپنے دوسرے سفر امریکہ سے واپس آ کر ایک مفصل خطاب مسجد شہداء لاہور میں کیا تھا جس میں مَیں نے اپنے ''شمالی امریکہ کے مشاہدات اور تاثرات'' بیان کیے تھے۔ یہ خطاب میثاق لاہور کی اشاعت بابت جنوری فروری ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا اور بعد میں ایک کتابچے کی صورت میں ''شمالی امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کا حال اور مستقبل'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ اس سے میری اس دَور کی امیدیں اور توقعات جنہیں اب ''یوفوریا'' سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے' اس کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے —— لیکن یہ کیفیت جلد ہی ختم ہو گئی اور مایوسی' بددلی اور صدمے کی کیفیت طاری ہونی شروع ہو گئی —— اور میری کیفیت جگرؔ کے اس شعر کے مصداق بن گئی کہ ؎

''یہی انجام کا مارا ہوا دل —— ہلاکِ عشرتِ آغاز بھی ہے!''

جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں' میرا ابتدا میں thrust اس جانب تھا کہ وہاں کے لوگوں کی پاکستان کی تحریک اسلامی کے لیے بازیافت کی جائے —— لیکن جلد ہی محسوس ہو گیا کہ ؎

''ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنکر سب بلّوری ہیں یاں ایک پرانا مٹکا ہے!''

کے مصداق وہاں کے لوگ ''زمیں جنبد نہ جنبد گُل محمدؐ'' کے عین مطابق واپسی کے لیے ہرگز آمادہ نہیں —— پھر بعض تجربات ایسے بھی ہوئے کہ چند رفقاء نے میری آواز پر کان دھرا اور پاکستان واپس آ گئے تو چند ہی مہینوں میں کچھ اپنے اعزہ و اقرباء کے ہاتھوں لٹ پٹ کر' اور کچھ یہاں کے کاروباری اور عام شہری و سرکاری ماحول کے ہاتھوں تنگ ہو کر اپنی پونجی ضائع کر کے واپس امریکہ جانے پر مجبور ہو گئے!

دوسری جانب یہ بھی محسوس ہوا کہ جو لوگ امریکہ میں ساتھ آئے ہیں وہ بھی SSQ اور TINA دونوں کو صرف ایک سوشل اور کچھ درس و تدریس کا حلقہ بنانے سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہاں کے ماحول کی گرفت' پھر اپنی معاش کی مصروفیات مزید کوئی نتیجہ خیز کام کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔ اور ظاہر ہے کہ دعوت و اقامتِ دین کی سعی و جُہد ایک

ضمنی سی پارٹ ٹائم activity سے بہت بڑھ کر تقاضا کرتی ہے —— اس زمانے میں مَیں نے اپنے ایک سب سے قریبی ساتھی کو‘ جن کے ساتھ حقیقی بھائیوں کا سا تعلق قائم ہو گیا تھا‘ ایک خط میں یہ الفاظ بھی لکھے کہ: ’’میں نے تو سمجھا تھا کہ امریکہ میں ہیرے اور جواہرات موجود ہیں‘ لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ ع ’’یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے‘‘ کے مصداق وہاں بھی پاکستان کی طرح کنکر اور پتھر ہی ہیں!‘‘

بہرحال گاڑی اسی طرح چلتی رہی —— اور جیسے انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنے حواریوں کو ڈانٹتے اور ڈپٹتے طعن و ملامت کرتے رہتے تھے‘ میں بھی اپنے ساتھیوں کو ملامت کرتے اور طرح طرح سے جھنجھوڑتے ہوئے ساتھ چلتا رہا۔ اس لیے کہ ساتھی یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے اور از سرِ نو تجدید عہد کر لیتے تھے!

اس کے ساتھ ہی میں بھی ایک سیڑھی نیچے اتر آیا اور میں نے ستمبر ۱۹۹۰ء میں رفقاء کے ایک بڑے اجتماع سے‘ جو ڈیٹرائٹ (مشی گن) میں منعقد ہوا تھا‘ یہ تصور پیش کیا کہ آپ لوگ مستقل طور پر پاکستان نقل مکانی کرنے کی بجائے یہیں رہتے ہوئے پاکستان میں تنظیم اسلامی کی مدد کریں —— جو دو صورتوں میں ہو سکتی ہے: (i) مالی اعانت اور (ii) ہر سال ایک ماہ نہیں تو کم از کم تین ہفتے کے لیے پاکستان آ کر اپنے اعزہ و اقارب اور دوستوں اور احباب تک تنظیم کی دعوت پہنچائیں —— یہ تقریر ’’میثاق‘‘ کی اکتوبر اور نومبر ۱۹۹۰ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئی تھی —— اور یہی تقریر تھی جس کے ردّعمل کے طور پر تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ میں ’’بغاوت‘‘ ہو گئی! اور اوپر جس قریب ترین ساتھی کا ذکر آیا ہے اور جسے میں نے TINA کا امیر نامزد کیا تھا‘ انہوں نے رفقاء کا اجتماع کر کے یہ ریزولیوشن پاس کرا لیا کہ —— (۱) اپنی صاف آمدنی (net income) کا پانچ فیصد بہت زیادہ ہے‘ کم ہونا چاہیے۔ (طے غالباً یہ ہوا تھا کہ اس میں دو فیصد پاکستان جائے گا اور تین فی صد سے یہاں دعوت کی توسیع اور تنظیمی اخراجات کیے جائیں گے۔) اور (۲) ہمارا پاکستان ہر سال جانا ممکن نہیں ہے‘ لہٰذا یہ فیصلے واپس لیے جائیں —— اور آئندہ کے لیے تنظیم کی اساس بیعت کی بجائے عام دستوری و جمہوری اصول پر قائم ہونی چاہیے!

اس پر میرا صدمہ فطری تھا —— اس صدمے کی حالت میں مَیں ۱۹۹۱ء میں امریکہ گیا تو

وہاں شکاگو میں منعقدہ اجتماع میں مَیں نے اپنے غم اور غصے کا اظہار کر کے سب کو بیعت کے قلادے سے آزاد کر دیا —— اور گویا اپنی بارہ سال کی محنت پر ’’اِنَّا لِلّٰہ‘‘ پڑھ کر واپس آ گیا۔ واضح رہے کہ اسی سفر سے واپسی پر نیویارک میں میرے گھٹنوں میں درد شروع ہوا جو یقیناً اسی صدمے کا نتیجہ تھا —— اور جو بعد میں مسلسل بڑھتا گیا‘ تا آنکہ ۱۹۹۸ء میں مجھے دونوں گھٹنوں کی سرجری کرانی پڑی ——!

اس سب کے باوصف میں نے ان سابقہ رفقاء سے کہا کہ آپ اب خود SSQ کو منظم کر لیں —— یا TINA کو جمہوری و دستوری اساس پر از سرِ نو منظم کر لیں —— میں یہ دونوں نام آپ کے حوالے کرتا ہوں —— اور ساتھ ہی وعدہ کرتا ہوں کہ حکم قرآنی ﴿**تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠**﴾ (المائدۃ:۲) کے مطابق میرا تعاون ہی نہیں‘ سرپرستی بھی آپ کو حاصل رہے گی —— البتہ جو رفقاء از سرِ نو بیعت کر لیں وہ یہاں "Freinds of Tanzeem-e-Islami Pakistan-FOTIP" کے عنوان کے تحت اپنی جمعیت کو برقرار رکھیں۔ لیکن ہونا کیا تھا؟ بہت سے لوگ جنہیں بیعت کے قلادے سے آزادی مل گئی تھی انہوں نے ’’جان بچی سو لاکھوں پائے!‘‘ کے سے انداز میں گوشہ عافیت میں پناہ لے لی‘ اور نہ SSQ آگے چل سکی اور نہ TINA! البتہ خاصی معتدبہ تعداد میں رفقاء نے تجدیدِ بیعت کر لی اور اس طرح FOTIP کا قافلہ چل پڑا۔

اس حادثے کے بعد میں نے تو اپنے طور پر نارتھ امریکہ کا chapter بالکل close کر دیا تھا‘ لیکن دو واقعات کی بنا پر وہاں جلد ہی ایک نیا باب کھل گیا —— ان میں سے پہلی بات یہ کہ انجینئر برادرم عطاء الرحمٰن‘ جو امریکہ میں MSA کے ابتدائی ارکان میں سے تھے‘ جس نے بعد میں ایک بہت بڑی تنظیم ’’اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ‘‘ (ISNA) کی صورت اختیار کر لی تھی‘ کچھ عرصہ کے لیے بسلسلۂ ملازمت سعودی عرب چلے گئے تھے —— انہوں نے وہاں پورے انشراحِ صدر کے ساتھ تنظیم میں شمولیت اختیار کی اور وہاں کی امارت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا —— اور پھر جب وہ وہاں سے فارغ ہوئے تو انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ آپ حکم دیں تو میں پاکستان آ جاؤں اور

اجازت دیں تو امریکہ ہی واپس چلا جاؤں۔ میں نے جب ان کے خاندانی حالات معلوم کیے تو علم ہوا کہ ان کا سارا خاندان والدین' بھائی بہنیں اور سسرال والے سب امریکہ میں ہیں۔ دوسرے ان کا اردو کا لہجہ خالص حیدر آبادی تھا جو پاکستان میں دعوت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا تھا' لہٰذا میں نے انہیں امریکہ واپسی کی اجازت دے دی اور انہیں "FOTIP" کا امیر مقرر کر دیا—— دوسرے یہ کہ میرے امریکہ کے ویزا میں ابھی گنجائش تھی کہ ایک سفر کر سکوں اور جب یہ مہلت تیزی سے ختم ہو رہی تھی تو میں سوچ ہی رہا تھا کہ یہ ویزا بے کار جائے گا —— کہ اچانک تنظیم اسلامی کے ایک رفیق کے ذریعے ان کے اعزہ مقیم نیوجرسی کی جانب سے زوردار دعوت مع واپسی ٹکٹ کی رقم کے موصول ہوگئی۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ امریکہ کا ایک آخری سفر کر ہی لیا جائے!

اس سفر میں پھر دو باتیں بہت غیر متوقع پیش آگئیں—— ایک یہ کہ نیوجرسی اور نیویارک سے بڑی تعداد میں لوگ تنظیم میں شریک ہو گئے۔ (اس سے قبل اس علاقے میں تنظیم کا کوئی وجود نہیں تھا اور نیویارک میرے لیے اکثر و بیشتر صرف پورٹ آف انٹری اینڈ ایگزٹ کی حیثیت رکھتا تھا!) دوسرے یہ کہ اس سفر میں نیویارک پہنچنے کے دوسرے ہی روز میں نے ٹرنٹن کی جامع مسجد میں انگریزی زبان میں جمعہ کا خطبہ دیا تو یہ بیان جس روانی اور سلاست کے ساتھ ہوا اس سے خود میں حیران رہ گیا —— اور میں نے اسے من جانب اللہ اشارہ سمجھا کہ یہاں کی صورت حال سے مایوس نہ ہو اور کام جاری رکھو!

بہرحال اس وقت سے تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ کا ایک نیا دور شروع ہوا جس کے لیے ہم نے نام بھی دوبارہ TINA ہی کا اختیار کر لیا' اور جس کی مسلسل ترقی اور استحکام میں سب سے بڑھ کر نتیجہ خیز مساعی برادرم عطاء الرحمٰن ہی کی رہیں —— چنانچہ اُس وقت سے TINA مسلسل ترقی کرتی رہی —— تا آنکہ سال ۲۰۰۲ء کا جو کنونشن حال ہی میں ۲۵ تا ۲۹ دسمبر نیوجرسی میں ہوا ہے اس میں ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعہ کے بعد کے حالات کی بنا پر پہلی بار میری شمولیت تو نہ ہو سکی' لیکن اس کی روداد سے محسوس ہوتا ہے کہ اب TINA نے امریکہ کے امیگرنٹ مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی زندگی میں صاحبِ تشخص اور قابلِ ذکر مقام حاصل کر لیا ہے ——!

امریکہ میں تنظیم اسلامی کی اس نشاۃ ثانیہ اور اس کے ضمن میں اپنے کردار کو از سرِ نو ایک جدید جذبے کے ساتھ شروع کرنے میں دو عوامل فیصلہ کن ثابت ہوئے تھے: ایک یہ کہ امریکہ سمیت مغربی دنیا میں جا بسنے والے مسلمانوں کی نئی نسل جو وہاں ہی پیدا ہوئی اور پلی بڑھی اور اس نے وہیں تعلیم حاصل کی' اس کا بڑا حصہ تو اگرچہ وہاں کے رنگ میں رنگا جا رہا تھا' لیکن ایک معتد بہ تعداد میں ایسے نوجوان بھی تھے جن میں مذہبی اور دینی جذبہ و عمل حیران کن مقدار میں موجود تھا—— اور وہ جس اعتماد کے ساتھ اسلام پر جازم و عامل ہیں اور وہاں کے لوگوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے تھے وہ بہت قابل قدر تھا—— اور ان کے جذبات کو صحیح راہ عمل پر ڈالنا بہت ضروری ہے—— ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ مشتعل ہو کر کوئی غلط راستہ اختیار کر لیں۔ دوسرے یہ کہ آخر امریکہ کے باشندوں میں سے بھی تو کچھ مسلمان ہیں (خصوصاً افریقی امریکی مسلمان) جن کا پاکستان منتقل ہونا ظاہر ہے کہ خارج از بحث ہے اور پھر جو امیگرنٹ مسلمان وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے ہیں ان پر بھی تو وہی دینی فرائض عائد ہوتے ہیں جن کے ادراک و شعور کے نتیجے میں عالَم اسلام میں احیائے اسلام اور غلبۂ دین کی تحریکیں چل رہی ہیں—— مزید یہ کہ امریکہ اس وقت عالَم انسانیت کا اعصابی مرکز (Nerve Centre) ہے' جہاں سے پوری دنیا کو پیغام پہنچ سکتا ہے—— اور عالَم اسلام کی بعض تحریکات جو ردِّعمل (reaction) کے نتیجے میں تشدد پسندی اور دہشت گردی کی جانب رخ کر رہی ہیں' انہیں یہاں سے ''منہج انقلابِ نبویؐ'' کا صحیح شعور پہنچایا جا سکتا ہے——! بنابریں امریکہ میں TINA کی یہ ''نشاۃ ثانیہ'' بہت بابرکت ثابت ہوئی اور TINA جو اس سے قبل صرف ہندو پاک کے امیگرنٹس پر مشتمل تھی اس میں بعض نہایت قیمتی افراد عرب اور دیگر ممالک سے آنے والوں میں سے بھی شریک ہو گئے!

TINA کی اس تعمیر جدید کے ضمن میں اس نئے دور کے تقاضوں کے طور پر بعض باتیں میں نے ابتداء ہی سے کہنی شروع کر دی تھیں' مثلاً ایک یہ کہ اس کا medium اب انگریزی زبان کو ہونا چاہیے—— دوسرے یہ کہ اس کی قیادت اب ''مقامی'' ہونی چاہیے—— اور پاکستان سے اس کا قانونی یا دستوری تعلق ختم ہو جانا چاہیے! اس کے لیے میں نے ایک کنونشن میں ''دودھ چھڑانے'' (یعنی weaning) کی اصطلاح بھی استعمال کی!—— لیکن چونکہ ابھی

مقامی طور پر ایسی متفق علیہ قیادت سامنے نہیں آ سکی تھی‘ لہٰذا میرے ساتھ بیعت کا تعلق بھی برقرار رہا —— اور اس طرح TINA عالمی تنظیم اسلامی ہی کی ایک شاخ رہی —— اور میں بھی اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں وہاں کام چلاتا رہا!

لیکن اب TINA کو ایک اور بحران کا سامنا ہے‘ جو اگرچہ چھوٹے پیمانے اور محدود درجے کا ہے‘ لیکن اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ یہ تحریر اصلاً اسی کے ضمن میں اپنی رائے پیش کرنے کے لیے سپردِ قلم کی جا رہی ہے!

اس کا پس منظر یہ ہے کہ اس نئے دور کے آغاز میں چند ذہین و فطین نوجوان بھی تنظیم میں شامل ہوئے اور انہیں میری ۱۹۶۷ء کی ایک تحریر ’’اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام‘‘ بے حد پسند آئی۔ یہاں تک کہ وہ اس کے عاشق اور پرچارک بن گئے —— پھر چونکہ میں نے اپنی اس تحریر میں اُس جدید علم کلام کے قاعدے (primer) کی حیثیت سے علامہ اقبال کے مشہور خطبات کا تعارف کرایا تھا جس کی آج کے دور میں ضرورت ہے‘ لہٰذا انہوں نے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور پھر کمر کس لی کہ عہد حاضر کے فکر پر تنقید اور اسلامی فکری اساسات کو مبرہن کرنے کے لیے زندگی وقف کر دیں گے —— چنانچہ متعدد نوجوانوں نے اپنے تعلیمی کیریئر تبدیل کر کے فلسفہ و عمرانیات میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کے لیے یونیورسٹیوں میں داخلہ لے لیا!

میں نے ان نوجوانوں کی بھرپور پذیرائی کی —— اور خاص طور پر اس کی روحِ رواں کی حیثیت رکھنے والے نوجوان کی برملا تعریفیں کیں‘ انہیں پاکستان میں متعارف کرایا اور علیٰ رؤس الاشہاد کہا کہ جو کام میں نے ’’اسلام کی نشاۃ ثانیہ‘‘ میں تجویز کیا تھا اس کی جانب ہم پاکستان میں تو پیش رفت نہیں کر سکے‘ لیکن اب ان شاء اللہ امریکہ میں یہ کام بھرپور طریقے سے ہوگا۔ جس کے لیے میں نے امریکہ میں Institute of Quranic Wisdom (I.Q.W) کا نقشہ پیش کیا —— اور چونکہ اسلامک سنٹر آف نیویارک‘ فلشنگ‘ کوئنز‘ نیویارک کے صدر اور مجلس منتظمہ کے متعدد ارکان تنظیم میں شامل ہو گئے تھے اور اس کی جو شاندار تعمیر نو ہوئی اس کے ضمن میں بھی تنظیم کے ایک رفیق اور میرے خالہ زاد بھائی ممنون احمد مرغوب صاحب نے دن رات جان توڑ محنت کی تھی‘ لہٰذا توقع تھی کہ اسی عمارت میں I.Q.W بھی قائم ہو جائے گا۔

لیکن اس کے بعد دو حادثات پیش آ گئے: (۱) یہ کہ فلشنگ کے سنٹر کے بعض فعال ذمہ دار حضرات کی مخالفت کی بنا پر انتظامیہ نے وہاں I.Q.W کے قیام سے معذرت کر لی (اگرچہ تنظیم کے اجتماعات وغیرہ کے لیے وہاں کی facilities بھرپور طور پر دستیاب رہیں!) اور (۲) دوسرے یہ کہ اسی سنٹر میں نوجوان طلبہ و طالبات کے لیے ایک ماہ کا تربیتی کورس TINA اور IQW کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ اس کے دوران دو اہم ترین رفقاء کے درمیان تنازعہ ہو گیا جس نے غیر معمولی شدت اختیار کر لی۔ مجھے یہاں پاکستان میں اطلاعات ملیں تو مجھے شدید صدمہ ہوا‘ لیکن میں اتنی دور بیٹھا کیا کر سکتا تھا۔ میں نے TINA ہی کے پانچ سینئر رفقاء پر مشتمل کمیٹی بنا دی کہ فریقین کے بیان سن کر فیصلہ کریں کہ قصور کس کا ہے۔ اس کمیٹی نے بالاتفاق فیصلہ دیا کہ نوّے فیصد قصور ایک رفیق کا ہے اور دس فیصد دوسرے کا! —— اس کے بعد جب میں اپنی سالانہ یاترا پر امریکہ پہنچا تو نوّے فی صد قصوروار قرار دیے جانے والے رفیق میرے پاس آئے اور کہا کہ فیصلہ غلط ہوا ہے‘ آپ اسے reverse کر دیں۔ میں نے کہا کہ اگر میں ایسے ہی فیصلہ تبدیل کر دوں تو یہ گویا میرا اس کمیٹی کے خلاف اظہارِ عدم اعتماد ہوگا۔ البتہ تم باضابطہ اپیل (appeal) کرو تو میں از سرِ نو سماعت کر سکتا ہوں۔ جس پر انہوں نے کہا کہ ’’اپیل تو میں نہیں کرتا!‘‘ چنانچہ میں نے فیصلہ برقرار رکھا اور سالانہ کنونشن میں‘ جو چند روز بعد منعقد ہوا‘ انہوں نے جملہ رفقاء کے سامنے اپنی غلطی تسلیم کر کے معافی مانگ لی اور دونوں رفقاء بھرے اجلاس کے سامنے بغلگیر ہو گئے! —— لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ان دونوں کے مابین خلیج زیادہ گہری ہو چکی تھی اور یہ ظاہری میل ملاپ صرف دکھاوے کا تھا۔ چنانچہ جب میں اگلے سال امریکہ گیا (یعنی ۲۰۰۱ء میں) تو وہی ’’نوے ہزاری منصب دار‘‘ میرے پاس آئے اور مطالبہ کیا کہ فیصلہ ریورس کیا جائے اور مجھے IQW میں حتمی و قطعی اختیارات تفویض کر دیے جائیں‘ بصورت دیگر میں تنظیم میں نہیں رہ سکوں گا۔ میں نے عرض کیا کہ تنظیم میں شامل رہنا یا نہ رہنا تمہاری آزاد مرضی (sweet will) پر منحصر ہے‘ لیکن میں اس دھمکی کے تحت کوئی اقدام نہیں کر سکتا —— چنانچہ وہ تنظیم سے علیحدہ ہو گئے اور اس طرح ہم TINA اور IQW کے تحت متوقع علمی تحریک کی اہم ترین شخصیت سے محروم ہو گئے —— اور چونکہ ان کے حلقہ اثر میں سے چند ساتھی انہیں ’’مظلوم‘‘ سمجھتے تھے‘ لہٰذا وہ بھی تنظیم سے علیحدہ ہو گئے!

اس حادثے کا اثر فطری طور پر اس حلقے میں شامل دوسرے نوجوانوں پر بھی رنج اور صدمے کی صورت میں تو پڑا ہی ہے —— لیکن بعض نے امریکہ میں تنظیم اسلامی کے قیام اور امکاناتِ کار کے بارے میں از سرِ نو re-thinking بھی شروع کر دی ہے —— جن میں سے دو نوجوان مجھے اتنے ہی عزیز ہیں جتنا وہ ''یوسف گم گشتہ'' تھا جو ساتھ چھوڑ گیا —— اور ان سے بھی میری بعض بلند توقعات وابستہ ہیں' بلکہ صلاحیت کار کے اعتبار سے وہ غالباً بہت بہتر بھی ہیں! ان میں سے ایک نے کراچی سے ایم بی بی ایس کیا' ان کا پورا خاندان پہلے ہی امریکہ منتقل ہو چکا تھا' خود ان کی جیب میں بھی گرین کارڈ موجود تھا —— چنانچہ فوراً امریکہ روانہ ہو گئے' لیکن وہاں چند ماہ کے قیام کے بعد ہی یہ فیصلہ کر کے واپس آ گئے کہ نہ میں امریکہ میں رہوں گا —— نہ ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کروں گا' (یہ اپنے ہائی اسکول کے زمانے سے ماہنامہ ''میثاق'' کے قاری رہے تھے!) بلکہ دین کی خدمت کروں گا —— چنانچہ وہ لاہور آ گئے —— اور چونکہ انگریزی بہت اچھی لکھ لیتے تھے' لہٰذا قرآن اکیڈمی کے انگلش سیکشن کے انچارج ہو گئے —— جس کے تحت ایک سہ ماہی انگریزی جریدہ "QURANIC HORIZONS" کے نام سے جاری کیا۔ لیکن پھر علمی میدان میں دین کی خدمت کا جو غلغلہ امریکہ میں IQW کے تحت بلند ہوا تھا اس کی کشش نے انہیں بھی وہاں کھینچ لیا —— اور اب وہ امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے ایم اے کر لینے کے بعد پی ایچ ڈی کا مرحلہ طے کر رہے ہیں! —— دوسرے اہم رفیق امریکہ ہی میں دستیاب ہوئے تھے اور وہاں ایم ایس میکینکل انجینئرنگ کر چکے تھے' لیکن وہ بھی تنظیم میں شامل ہونے کے بعد اسی ''نشاۃ ثانیہ'' میں بیان کردہ کام کے لیے کمر کس چکے ہیں اور امریکہ کی عظیم یونیورسٹی "YALE" سے ایم اے کرنے کے بعد اب پی ایچ ڈی کے مرحلے سے گزر رہے ہیں —— اور ان دونوں کا اس خیال پر اتفاق ہو گیا ہے کہ امریکہ میں اسلامی انقلاب یا اقامتِ دین کا کام خارج از بحث ہے۔ یہاں صرف دعوت و تبلیغ ہونی چاہیے اور اس کے لیے ''بیعت سمع و طاعت'' کے بھاری بھرکم نظام کی چنداں ضرورت نہیں ہے' صرف ڈھیلا ڈھالا انجمن اور سوسائٹی ٹائپ کا نظم کفایت کرے گا! باقی ''کرنے کا اصل کام'' بلند ترین علمی سطح پر فکر مغرب کا ابطال اور امورِ ایمانی کا احقاق و اثبات ہے! —— چنانچہ ان دونوں نے حال ہی میں مجھے اپنی مفصّل تحریروں کے ذریعے ان امور کے ضمن میں قائل کرنے کی بھرپور اور مخلصانہ کوشش کی ہے!

مجھے یہ دونوں نوجوان بہت محبوب ہیں اور ان سے میری بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ ہیں اور مجھے یہ یقین بھی حاصل ہے کہ دونوں نہایت مخلص ہیں —— اور انہوں نے تا حال تنظیم کے نظم کی کوئی نمایاں خلاف ورزی بھی نہیں کی ہے' لیکن میرے نزدیک ان کی سوچ یک رخی ہو گئی ہے اور میرے دینی و تحریکی افکار کا ایک پہلوان کی نگاہوں میں اس درجہ کھب گیا ہے کہ دوسرا رخ پوری طرح اجاگر نہیں رہا!

میری مراد اس سے یہ ہے کہ آج سے ٹھیک پینتیس سال قبل ۱۹۶۷ء میں جبکہ میری عمر بھی ٹھیک پینتیس سال ہی تھی' گویا میری زندگی کے عین ''نصف النہار'' پر میرے دینی اور تحریکی فکر کا اظہار دو تحریروں کی صورت میں ہوا: ایک ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' جو مئی ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی —— اور دوسری ''تنظیم اسلامی کی قرارداد تأسیس اور اس کی توضیحات'' جو اسی سال ستمبر اکتوبر میں شائع ہوئی۔ ان میں میرے دینی اور تحریکی فکر کے دو رخ بیان ہوئے —— جن کی ایک دوسرے کے ساتھ عکسی (یعنی reciprocal) نسبت بھی تھی اور عونی (یعنی complementary) بھی! اور یہ دونوں گویا گاڑی کے دو پہیوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مقدم الذکر کام کے لیے پہلے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم ہوئی' پھر قرآن اکیڈمی وجود میں آئی! جس کے تحت قرآن اکیڈمی فیلو شپ کی سکیم شروع کی گئی —— لیکن بوجوہ ہمارا یہ کام زیادہ نہیں بڑھ سکا۔ دوسرے کام کے لیے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کی باضابطہ تأسیس ہوئی جس کے لیے ۱۹۷۷ء میں ''بیعت سمع و طاعت فی المعروف'' کی اساس اختیار کر لی گئی۔ اس دوسرے کام کی جانب الحمدللہ پیش رفت خاصی اطمینان بخش تھی' لہٰذا یہاں ہماری توجہ بھی زیادہ تر اسی کی جانب ہو گئی۔

ان میں سے مقدّم الذّکر تحریر کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے موجودہ دنیا کے ''آسمان'' سے بحث کی' یعنی یہ کہ اس وقت پوری دنیا میں ایک عالمی (global) تہذیب کا غلبہ ہے جس کی بنیاد خالص مادی فکر و نظر پر قائم ہے جس نے اس پورے کُرۂ ارضی کو پوری طرح ڈھانپ لیا ہے —— جب تک اس فکر کے مدلّل ابطال کی صورت پیدا نہیں ہوتی نوعِ انسانی کا اس کے رعب اور دبدبے سے نکلنا ناممکن ہے' اور جیسے علامہ اقبال نے عہد حاضر کے بینکنگ نظام کے بارے میں کہا تھا کہ ؎

ایں بنوک ایں فکر چالاکِ یہود نورِ حق از سینۂ آدم ربود!
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سودائے خام!

اسی طرح جب تک اس مادی فکر و فلسفہ کی حرمت کا پردہ چاک نہیں کیا جاتا' کسی دینی دعوت و تحریک کا پنپنا آسان نہیں ہے! جس کے لیے ایسے باہمت اور ذہین و فطین نوجوانوں کی ضرورت ہے جو ایک جانب قرآن وسنت کے ''نورِ حق'' سے اپنے قلوب واذہان کو منور کرلیں اور دوسری جانب جدید فکر و فلسفہ اور عمرانیات کے مختلف شعبوں میں مہارت حاصل کرنے کے بعد—— آج کے دور کے لیے امام غزالیؒ کی ''تھافت الفلاسفہ'' اور امام ابن تیمیہؒ کی ''الردّ علی المنطقیین'' ایسی کتابیں تصنیف کریں' خواہ انہیں اس کے لیے روکھی سوکھی پر گزارا کرنا پڑے' یہاں تک کہ مارکس کی طرح فاقوں کی نوبت بھی آجائے!

جبکہ تنظیم اسلامی کی فکری اساس خالص زمینی (down to the earth) رخ سے بحث کرتی ہے—— یعنی اس کا موضوع ہر ہر فردِ نوعِ بشر کی اخروی نجات اور فوز و فلاح اور اس کے ضمن میں اپنی شخصیت اور سیرت کی صحیح رخ پر تعمیر اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے عائد شدہ جملہ فرائض کی ادائیگی ہے' اور ظاہر ہے کہ اس کی احتیاج ہر انسان کو ہے' خواہ وہ اَن پڑھ ہو یا عالم و فاضل' اور خواہ علمی کام کرسکتا ہو یا صرف بھاگ دوڑ اور جسمانی مشقت کے ذریعے دین کی خدمت کرسکے!—— اس غرض کے لیے ابتداء ہی میں دینی فرائض کی تین سطحوں کو واضح کیا گیا' یعنی عبادتِ ربّ' شہادت علی الناس اور اقامتِ دین' —— اور ان کے لیے سعیٔ مسلسل اور جہد یعنی جہاد فی سبیل اللہ کی قرآنی پکار کے حوالے سے ''مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ؟'' کی صدا بلند کی گئی! تاکہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد کے لیے جماعت کی شرطِ لازم پوری کی جاسکے!

میرے دینی فکر کے ان دو رُخوں میں فرق صرف اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کا ہے' ورنہ یہ دونوں ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) ہیں' جن کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں! چنانچہ ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ'' میں ایک عمومی دعوت کے ادارے کا ذکر موجود ہے اور تنظیم کی قرارداد تاسیس کی توضیحات میں اس علمی کام کی اہمیت مذکور ہے! گویا دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ﴿وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ﴾ (الذاریات:۴۹) کے سے انداز میں باہم پیوست اور مربوط ہیں!

ہمارے متذکرہ بالا دوستوں کے موقف کا ایک اساسی نکتہ یہ ہے کہ یہاں امریکہ میں صرف دعوت کا کام ہونا چاہیے' اقامت دین یا اسلامی انقلاب کا نام لینا حکمت عملی کے اعتبار سے بھی غلط ہے' اور معروضی حالات کے اعتبار سے بھی بہت دور' بہت دور کی بات ہے! اس کے لیے ایک دلیل اسوۂ رسول ﷺ سے بھی دی گئی ہے کہ آپؐ نے ابتداء میں کسی انقلاب یا نظام کو بدلنے کی بات نہیں کی!

اس کے ضمن میں اوّلاً تو یہ عرض ہے کہ مؤخر الذکر دلیل حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ غور کیجئے کہ دوسری یا چوتھی وحی ہی میں وارد شدہ الفاظ ﴿وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝۳﴾ (المدثر) کے معنے کیا تھے؟ کیا صرف اللہ اکبر کہہ دینا یا اللہ کی کبریائی کا ڈنکا بجا دینا اور اس کو بالفعل نافذ بھی کرنا؟ بقول اقبال ؎

یا وسعتِ اَفلاک میں تکبیرِ مسلسل یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات!

پھر ''اقامتِ دین'' —— اور عدلِ عمرانی کے قیام کا حکم کیا سورۂ شوریٰ میں وارد نہیں ہوا جو مکی دور کے وسطی زمانے میں نازل ہوئی ہے [بفحوائے ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ اور ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ!﴾]

ثانیاً غور فرمائیے کہ دعوتِ دین سے آپ کی مراد اس قسم کے کام ہیں جو ''دعوہ'' کے عنوان سے اسلامک سنٹرز اور بعض گروپوں کے ذریعے امریکہ میں ہو رہے ہیں یا واقعی اور حقیقی ''دعوتِ دین'' ہے (جس کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی شاہکار تصنیف ''دعوتِ دین اور اس کا طریق کار'' نہایت چشم کشا اور سبق آموز ہے!) —— مزید غور کیجئے کہ قرآن حکیم میں دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں: ایک ''دعوت الی اللہ'' اور دوسرے ''دعوت الیٰ سبیل الربّ'' —— اب فرمائیے اللہ کی جانب دعوت دینے میں آپ اپنے مخاطب کو کس اللہ سے متعارف کرائیں گے؟ کیا وہ جو صرف خالق و رازق ہے یا وہ جو المَلِک بھی ہے اور مالِکُ المُلک بھی' اور حاکم بھی ہے اور شارع (Law Giver) بھی! اب اگر آپ نے مصلحتاً دوسرے پہلو کو چھپایا تو آپ قرآنی اصطلاح ''الحاد فی اسماء اللہ'' کے جرم کے مرتکب ہوں گے —— آگے آیئے ''سبیل ربّ'' سے آپ کیا مراد لیں گے؟ —— ایک لفظ میں تو اس کے لیے ''عبادت'' کی اصطلاح کفایت کرتی ہے' لیکن سوچئے کہ آپ اس عبادت کا

مفہوم صرف پوجا پاٹ‘ حمد وثنا‘ یعنی صرف پرستش (worship) لیں گے یا اس کے جزوِ اعظم اطاعت کو بھی شامل کریں گے —— اور پھر یہ اطاعت صرف انفرادی زندگی میں ہوگی یا نظامِ اجتماعی پر بھی حاوی ہوگی؟ —— ساتھ ہی محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر ایمان کی دعوت بھی دیں گے تو کیا آپؐ کے اتباع میں آپ ﷺ کی پوری زندگی کی جدوجہد کے رخ کو نظرانداز کر دیں گے اور ’’اسوۂ رسول‘‘ کو صرف نماز روزے میں اتباع‘ اور داڑھیوں‘ ٹخنوں کے اوپر پاجاموں اور مسواک تک محدود رکھیں گے؟ یا اس اسوۂ رسولؐ میں آپ ﷺ کی پوری زندگی کی انقلابی جدّوجُہد کو بھی شامل کریں گے؟ —— گویا بات وہی ہے کہ ؎

’’جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ ناچار گنہ گار سوئے دار چلے ہیں!‘‘

یہ صحیح ہے کہ ابتداءِ دعوت میں اس کے آخری مضمرات کا ڈنکے کی چوٹ بیان کرنا ضروری نہیں ہے —— لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں پاکستان میں بھی مسلمانوں ہی میں کام کرنا ہے اور امریکہ میں بھی ہمارے اوّلین مخاطب جن میں سے ابتدائی اعوان و انصار کے دستیاب ہونے کی امید کی جاسکتی ہے وہ لامحالہ مسلمان ہی ہیں —— اور مسلمانوں میں دین کے نام پر کئی دعوتیں اور تحریکیں چل رہی ہیں۔ اس پس منظر میں اپنی دعوت کے تشخص کے لیے ہمیں ابتدا ہی سے اپنی دینوی سعی و جُہد کے آخری ہدف کی وضاحت کے لیے حکومتِ الٰہیہ‘ یا غلبۂ دین‘ یا اقامتِ دین یا قیامِ نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی اصطلاحیں ہی استعمال کرنی پڑیں!

پھر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس انقلابی دعوت کے پنپنے کی امید صرف ایسے ملک میں کی جاسکتی ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں —— امریکہ میں تو ہم آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتے ہیں! —— واقعہ یہ ہے کہ یہ دلیل بھی عذرِ لنگ اور معروضی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔ مسلمان اکثریت والے ممالک میں فرقہ پرستی اور سیاسی حوصلہ مندی اور طالع آزمائی دو لعنتیں ایسی ہیں جو صحیح اسلامی دعوت کے پنپنے میں سدِ سکندری کی طرح حائل ہیں —— اور ان پر مستزاد نفس پرستی اور طلبِ دنیا کی ہوس! —— اور سب سے بڑھ کر مغرب کی مرعوبیت اور اس کی اندھی نقالی ایسے مہلک امراض ہیں‘ جبکہ غیر مسلموں کو دعوت دینے میں ان میں سے کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے —— بشرطیکہ دعوت کے تقاضے پورے کیے جائیں اور اس کی دھن سوار ہو جائے! اور وقت اور قوت اور ذرائع و وسائل کا بیشتر حصہ اس کے لیے وقف کیا جائے!

میرا اٹھارہ برس کی عمر سے (۱۹۵۰ء سے) پختہ موقف یہ ہے کہ بندۂ مومن خواہ کوئی بھی اور کہیں بھی ہو‘ اس کا اوّلین فرض ہے کہ جس نظام کے تحت رہ رہا ہے اس میں جس حد تک بھی ممکن ہو (خواہ مشکل کتنا ہی ہو) اپنے وجود اور اپنے گھر پر اسلام کو نافذ کر کے عبادتِ ربّ کے تقاضے کو پورا کرے —— پھر اسی دعوت کا پرچارک بن کر کھڑا ہو جائے اور جتنے بھی ساتھی ملیں انہیں ایک جماعتی نظم میں منسلک کر کے قوت کی شکل دے —— اور پھر اگر یہ قوت معتدبہ حد تک فراہم ہو جائے تو نظامِ باطل کو ختم کر کے دینِ حق کو قائم کرنے کی کوشش کرے —— اور یہ فرائض ہر مومن پر عائد ہوتے ہیں خواہ وہ کسی ملک اور سرزمین میں‘ اقلیت کا کیا سوال‘ بالکل تن تنہا ہو! جس کے ضمن میں عظیم ترین مثال خود نبی اکرم ﷺ کی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ معتدبہ حد تک افرادی قوت دستیاب ہوتی ہے یا نہیں تو اس کا دار و مدار اللہ کی مشیت اور ماحول کی نوعیت پر ہے! جس کی ممکنہ صورتوں میں سے ایک انتہا پر حضرتِ نوح علیہ السلام ہیں جنہیں ساڑھے نو سو برس میں بھی کوئی response نہیں ملا —— اور دوسری انتہا پر سید المرسلین اور خاتم النبیین ﷺ ہیں جنہیں تھوڑی سی مدت میں مناسب قوت فراہم ہو گئی!

اسی طرح کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ آنحضور ﷺ نے بیعت سمع و طاعت اُس وقت لی تھی جب باطل کو چیلنج کرنے یعنی اقدام اور تصادم کا مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ میں بارہا واضح کر چکا ہوں کہ اس سے قبل آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین رسول اور امتی کا جو رشتہ تھا کیا وہ سمع و طاعت کے تقاضے بتمام و کمال پورے نہیں کرتا تھا؟ —— تو آیا اب پہلے مرحلے کے لیے تنظیم کی اساس ہمیں لازماً جدید دنیا کے مروّجہ اساسات ہی میں سے لینی ہوگی یا ہم اس دلیل کے تحت کہ ایک فرض اور واجب و مسنون کام کے لیے ہم کوئی نئی بنیاد کیوں اختیار کریں —— کیوں نہ اسی بیعت کو ذرا stretch کر لیں؟ —— اس ضمن میں میری زندگی کے اہم واقعات میں سے یہ بھی ہے کہ جب ہم نے تنظیم اسلامی کے لیے بیعت کی اساس اختیار کی اور اس کا کچھ چرچا ہوا تو بعض علماء نے اس کے خلاف فتویٰ دیا —— اس ضمن میں اس سے قطع نظر کہ مولانا سید حامد میاںؒ نے میری تائید کی اور مخالفوں کو مسکت جواب دیا۔ میں مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے ان سے دریافت کیا کہ ان کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے‘ جس پر انہوں نے پہلے تو بے ساختہ فرمایا کہ: ’’یہ بیعت بالکل غلط

ہے!'' —— پھر میں نے اپنے سوال کو دو حصوں میں تقسیم کیا کہ ''اولاً یہ فرمائیے کہ کیا موجودہ حالات میں دین کی خدمت اور فروغ کے لیے جماعت بنانا جائز ہے یا نہیں؟'' فوری جواب ملا: ''بالکل جائز ہے!'' اس پر میں نے دوسرا سوال کیا کہ ''اس جماعت سازی کے لیے کوئی مسنون اساس ہے یا نہیں؟'' تو چونکہ ہمارے علماء بالعموم اور مفتی حضرات بالخصوص منطق کے بڑے ماہر ہوتے ہیں' لہٰذا مفتی عثمانی صاحب نے ایک لحظہ کی تاخیر کے بغیر فرمایا کہ: ''ٹھیک ہے بیعت جائز ہے' لیکن آپ کی نہیں!'' اس پر میں نے پوچھا کہ ''میری کیوں نہیں؟'' تو فرمایا کہ: ''آپ نے کسی سے بیعتِ ارشاد کر کے اپنا تزکیۂ نفس نہیں کرایا!'' اس پر میں نے صرف یہ کہہ کر خاموشی اختیار کر لی کہ: ''چلیے ٹھیک ہے' ہمارا پچاس فیصد تو اتفاق ہو گیا ہے' بقیہ پر پھر کسی موقع پر گفتگو کریں گے'' —— بعد میں مولانا سید حامد میاںؒ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ: ''جو شرط انہوں نے لگائی ہے وہ بیعت ارشاد کے لیے ہے جبکہ آپ کی بیعت جہاد کے لیے ہے۔ اور اس کے ضمن میں نہ صرف یہ کہ یہ شرط عائد نہیں ہوتی' بلکہ اس نوع کی بیعت میں افضل مفضول کے ہاتھ پر بیعت کر سکتا ہے!'' یعنی علم' تقویٰ اور تدین میں بہتر اور برتر شخص ان چیزوں میں اپنے سے کمتر کے ہاتھ پر بیعت کر سکتا ہے —— اور اس کے ضمن میں مثال یہ بیان فرمائی کہ ''۱۹۳۰ء کے آس پاس قادیانی فتنے کی سرکوبی کے لیے جدوجہد کی غرض سے تنظیمی ڈھانچہ بنانے کے لیے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے ہاتھ پر سینکڑوں علماء نے بیعت کی تھی جن میں بیہقیٔ وقت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ اور شیخ الوقت مولانا احمد علی لاہوریؒ بھی شامل تھے!''

اس پر مستزاد ہیں عقلی اور عملی دلائل و شواہد جن کی رو سے کسی ''تحریک'' کے لیے صرف بیعت ہی کی قسم کا نظامِ جماعت مفید ہوتا ہے' ڈھیلی ڈھالی انجمنیں سماجی' تعلیمی اور اصلاحی کاموں کے لیے کفایت کرتی ہیں' اور چار آنے کی ممبری والی جماعت صرف سیاسی مقاصد کے لیے مفید ہوتی ہے! —— البتہ یہ دوسری بات ہے کہ اس سمع و طاعت فی المعروف کو ڈکٹیٹرشپ یا آٹوکریسی کے ہم معنی نہ لے لیا جائے' بلکہ اس میں ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ'' اور ''أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ'' کی روح کو بتمام کمال ملحوظ رکھا جائے! —— خود میں نے تنظیم کی ستائیس سالہ امارت کے دور میں صرف ایک بار مجلس شوریٰ کی اکثریت کے خلاف فیصلہ کیا اور وہ بھی جبکہ اکثریت و اقلیت میں کل سولہ اور چودہ آراء کا فرق تھا! —— تاہم یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ

''بیعت سمع و طاعت فی المعروف'' کی اساس پر قائم جماعت اور جدید جمہوری اور دستوری جماعتوں کے مابین فرق بہت گہرا ہے' اور ان دونوں میں اشخاص و افراد کی نفسیات سے لے کر' امارت و قیادت کے نصب و عزل' اور اظہارِ اختلاف کے انداز اور ہدف کے مابین زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں میری ایک تحریر ''تحریک اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ —— یا چناں کن یا چنیں'' اپریل ۱۹۹۶ء کے ''میثاق'' میں شائع ہوئی تھی جسے دوبارہ جنوری ۲۰۰۳ء کے شمارے شائع کر دیا گیا تھا —— اس کا بنظر غائر مطالعہ نہایت ضروری ہے!

قصہ مختصر یہ کہ یہ ہے میرے دینی فکر کے اس دوسرے رخ کا وہ خلاصہ جو اس وقت بعض نہایت مخلص رفقاء کی نگاہوں میں مدھم پڑ گیا ہے —— تاہم یہ میرے عمر بھر کے غور و فکر کا حاصل بھی ہے اور میں اٹھارہ سال کی عمر سے لے کر اب ستر اکہتر سال کی عمر تک نصف صدی سے زیادہ اس پر عمل پیرا بھی رہا ہوں —— اور جو تنظیم میرے حوالے سے قائم ہو گی وہ اسی اساس پر قائم ہو گی —— اور ان شاء اللہ اسی پر قائم رہے گی! —— گویا بقول اقبال ؎

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر
مرے قافلے میں لٹا دے اسے لٹا دے' ٹھکانے لگا دے اسے!

اور اب آیئے ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ'' میں مذکور اعلیٰ علمی سطح پر تخلیقی اور تحقیقی کام کی جانب' تو میری رائے ہمیشہ یہ رہی ہے اور اب بھی یہی ہے کہ اسے تحریک کے عمومی دعوتی اور تنظیمی ڈھانچے کے تحت ہونا چاہیے' جو ایک جانب اس کام کے لیے اہل اور اس کے لیے کمر کسنے والے رفقاء کو سہولتیں بھی فراہم کرے اور تنظیمی ذمہ داریوں کے اعتبار سے انہیں رعایتیں بھی دے اور دوسری جانب ان کی نگرانی بھی کرے کہ کہیں موجود الوقت حالات کے دباؤ کے باعث کسی غلط رخ پر نہ پڑ جائیں! اس لیے کہ یہ میدان بڑا خارزار اور دشوار گزار ہے اور مغربی یونیورسٹیوں کے موجود الوقت علمی و ثقافتی ماحول کے رعب اور دبدبہ سے بالکل غیر متاثر رہنا آسان کام نہیں ہے! اور اس کے لیے ﴿كُونُوا مَعَ الصّٰدِقِينَ ﴿١١٩﴾﴾ (التوبۃ) کے حکم پر عمل اور ع ''پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ!'' کے سے انداز میں تحریک اسلامی کے بنیادی شجر سے وابستہ رہنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ مغربی اکیڈیمیا کے ماحول کے خارجی اثرات پر

مستزاد خود انسانی نفسیات کے داخلی عوامل کے زیر اثر بسا اوقات کسی شخص کے ذہن میں کوئی نیا خیال آ جاتا ہے اور وہ اسے ''دلیہ بہ گندہ بروزہ گندہ' و لے ایجادِ بندہ!'' کے سے انداز میں سینے سے لگا لیتا ہے اور پروان چڑھاتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اس کی پوری سوچ پر آکاس بیل کی طرح چھا جاتا ہے اور پودے یا درخت کی توانائی کو چٹ کر جاتا ہے ___ ماضی میں اس کی مثالیں بہت سی رہی ہیں اور خصوصاً مک گل یونیورسٹی آف مانٹریال ہمارے بہت سے ذہین و فطین لوگوں کو غلط رخ پر ڈالنے میں کامیاب رہی ہے ___! اس تلخ حقیقت کے پیش نظر عافیت اسی میں ہے کہ اعلیٰ علمی سطح پر تخلیقی اور تحقیقی کام کے اتھاہ سمندر میں چھلانگ لگاتے وقت کمر کے ساتھ کوئی تنظیمی ڈور بندھی ہوئی ہو یا یوں کہیے کہ اعلیٰ علمی کام کرنے والوں کے لیے محفوظ تر راستہ یہی ہے کہ وہ کسی تنظیمی اور جماعتی سلسلہ کے حصار یا ''حِصْن'' میں قلعہ بند ہوں۔

پھر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ اس اعلیٰ علمی کام کے مخاطب اگرچہ اعلیٰ علمی طبقات ہی ہوتے ہیں' تاہم تاریخ شاہد ہے کہ ان میں سے شاذ ہی کوئی شخص اس کی بنا پر اپنی روش کو تبدیل کر کے راہِ حق کی جانب آتا ہے' اس علمی کام کی اصل افادیت بالواسطہ ہوتی ہے ___ یعنی یہ کہ موجود الوقت افکار و نظریات پر زوردار ضربیں لگا کر ان کے رعب اور دبدبے کو ختم کر دیں تاکہ خلق خدا کے ذہین عناصر کے ذہنوں پر غلط افکار کے تانے بانے سے مرعوبیت نے جو حجاب طاری کر دیا ہوتا ہے وہ ختم یا کمزور ہو جائے ___ تاکہ پھر قرآن کی دعوت آسانی کے ساتھ ان کے ذہنوں سے گزر کر قلوب تک رسائی حاصل کر سکے! ___ باقی اصل ہدایت تو لامحالہ قرآن حکیم ہی سے آئے گی ___ بفحوائے فرمانِ نبوی ﷺ ((وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى مِنْ غَيْرِهٖ (مِنْ غَيْرِ الْقُرْآنِ) اَضَلَّهُ اللّٰهُ)) یعنی جو شخص بھی قرآن حکیم کے سوائے کسی اور ذریعے سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے لازماً گمراہ کر دے گا!

اب اگر میری ان گزارشات سے ہمارے وہ نوجوان امریکی ساتھی جو علمی جہاد کے لیے کمر کس چکے ہیں یا ابھی پر تول رہے ہیں ___ ''باز آ باز آ' آں ہر چہ ہستی باز آ!'' کے انداز میں اپنے خیالات سے رجوع کر لیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ فھو المطلوب! ___ اس سے جو خوشی اور مسرت مجھے ہوگی اس کا اندازہ ویسے تو دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں لیکن ع ''دل را بہ دل رہیست!'' کے مصداق خاص طور پر خود ان کو اس کا صحیح ترین اندازہ ہوگا ___ اور اگر

بصورت دیگر وہ اپنے خیالات پر جازم رہتے ہیں تب بھی میری پیشکش وہی ہوگی جو ۱۹۹۰۔۹۱ء میں TINA کے پہلے بحران سے متعلق رفقاء کو دی تھی۔ وہ اپنا نیا نظم تشکیل دیں اور اپنے خیالات کے مطابق کام کریں۔ چنانچہ میں نے جس طرح اس وقت SSQ اور TINA دونوں نام ان کے حوالے کر دیے تھے اب بھی IQW ان کے حوالے کرنے کو تیار ہوں ___ اور ان کے ساتھ میرا تعاون بھی' ان شاء اللہ العزیز' جس حد تک وہ چاہیں گے انہیں حاصل رہے گا۔ لیکن وہ TINA کی قلبِ ماہیت اور اسے رجعتِ قہقہری کے ذریعے ''جماعت'' سے گرا کر ''انجمن'' کی سطح پر لانے کی کوشش ترک کر دیں! ___ نَصَرَنا اللّٰہ وایّاھُم لما یحبّ ویرضٰی!! ___ وآخِر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین!

ویسے میرے نزدیک اسلام کی حقیقی دعوت کے لیے امریکہ میں حالات جتنے اس وقت سازگار ہیں اس سے قبل کبھی نہیں تھے۔ ضرورت صرف اصحابِ ہمت اور اربابِ عزیمت کی ہے' ورنہ کیفیت واقعی وہی ہے جس کا نقشہ اقبال نے اس شعر میں کھینچا ہے کہ ؎ ''موسم اچھا' پانی وافر' مٹی بھی زرخیز۔ جس نے پھر بھی کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان!'' ___ اس لیے کہ اوّلاً: وہاں کے مسلمان امیگرنٹس جو پہلے امریکہ کی جنت ارضی میں اپنے آپ کو بہت محفوظ اور secure محسوس کرتے تھے' اب بری طرح متزلزل ہو گئے ہیں۔ اور اب جو فضا وہاں قائم ہوگئی ہے اس میں غیر قانونی طور پر مقیم لوگوں کے لیے تو وہاں سے ''فرار'' کے سوا کوئی چارہ کار ہے ہی نہیں۔ چنانچہ واپسی کا سیلاب شروع ہو چکا ہے' اور اس کا سب سے بڑا مقیاس یہ ہے کہ پاکستان میں real estate کی قیمتیں ایک دم بڑھ گئی ہیں ___ البتہ قانونی طور پر مقیم لوگوں کو عام طور پر بھی وہاں سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ اور اس ضمن میں اس فرمان نبویؐ پر قیاس کی ضرورت ہے جس کی رو سے کسی مقام پر وبا پھوٹ پڑے تو وہاں سے نقل مکانی درست نہیں ہے ___ البتہ جو لوگ وہاں ''دعوتِ دین'' کے لیے کمر کس کر مقیم رہیں وہ تو بہت ہی تہنیت اور مبارکباد کے مستحق ہیں! ___ (یا پھر وہ لوگ تہنیت اور مبارک باد کے مستحق ہوں گے جو پاکستان اس عزم کے ساتھ واپس آئیں کہ تن مَن دھن یہاں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے وقف کر دیں گے!)

اس ضمن میں خاص طور پر عرب ممالک سے آمدہ امیگرنٹس سے بڑے پیمانے پر رابطے کی ضرورت ہے۔ میں نے ۱۹۸۰ء میں جو تقریر اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کے کنونشن منعقدہ نیاگرا میں کی تھی جس میں ''پندرہویں صدی ہجری: توقعات اور اندیشے'' کے سلسلے میں کہا تھا کہ اُمّتِ مُسلمہ پر ابھی عذابِ الٰہی کے مزید اور شدید تر کوڑے برسنے والے ہیں جن میں سب سے بڑا حصہ اُمت عرب کو ملے گا —— وہ حالات اب سب کے سامنے ہیں۔ (چند سال قبل میں نے یہی بات سانتا کلارا میں جمعہ کے بڑے اجتماع سے خطاب کے دوران کہی تو وہاں کے عرب بھائی بہت ناراض ہوئے تھے' لیکن اب حال ہی میں وہاں کے ایک رفیقِ تنظیم پاکستان آئے تو انہوں نے بتایا کہ اب وہی حضرات تسلیم کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے درست کہا تھا!)

امریکہ میں دعوتِ دین واقعتاً دعوتِ ''دین'' ہونی چاہیے اور اس سے میری مراد یہ ہے کہ دین کہتے ہیں نظام کو —— لہٰذا زیادہ زور اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی پر ہونا چاہیے' جس کے ضمن میں خاص طور پر Multi-nationals اور Globalization کے خلاف شدید ردعمل خود وہاں موجود ہے ——! دوسری جانب حضرت مسیح علیہ السلام کی شخصیت کے ضمن میں قرآن حکیم کے بیانات اور احادیثِ نبویہؐ میں وارد شدہ نزول مسیحؑ (یعنی Second Coming of Jesus) کی اشاعت بڑے پیمانے پر ہونی چاہیے —— اور میرا کتابچہ "To Christians with Love !" بھی شائع کیا جانا چاہیے!

اس کے علاوہ آج سے آٹھ دس سال قبل واشنگٹن ایریا کے ایک اچھے بڑے اجتماع میں اپنے خطاب کے اختتام پر جو motto یا slogan میں نے دیا تھا' اب اس کو عام کرنے کی ضرورت ہے' یعنی:

"YES! WE ARE FUNDAMENTALISTS, BUT NOT TERRORISTS"

اور اس کی بھی شدید ضرورت ہے کہ اسامہ بن لادن اور کسی واقعی یا موہومہ تنظیم القاعدہ سے اظہارِ براءت کیا جائے —— اس کے ضمن میں یاد ہوگا کہ عالَمِ اسلام کی تحریکوں میں بھی جب مسلح مزاحمت اور تشدد اور توڑ پھوڑ یا قتل و غارت کے رجحانات پیدا ہوئے —— اور بعض جگہوں پر ballot کا راستہ رک جانے پر bullet کا راستہ اپنایا گیا تو اسے میں نے ہمیشہ غلط بلکہ مضر اور counter-productive قرار دیا —— اب اس نقطۂ نظر کی زیادہ اشاعت کی

ضرورت ہے!

اور اگر وہاں اس دعوتِ دین کے ضمن میں سختیاں یا قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں تو انہیں خوش دلی کے ساتھ خوش آمدید کہنا چاہیے —— کہ ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ (الاحزاب:۲۲) —— کیا عجب کہ اس سلسلے میں تفتیش (interrogation) کو بھی اللہ تعالیٰ وہاں ہمارے فکر کی اشاعت اور مقتدر حلقوں تک پہنچنے کا ذریعہ بنا دے! اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو!

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

پس نوشت..... جولائی ۲۰۰۳ء

کئی سال سے تنظیم اسلامی شمالی امریکہ کے رفقاء کے مابین ایک بحث چل رہی تھی کہ آیا اس کا تعلق مرکزی تنظیم اسلامی کے ساتھ' جس کا دفتر پاکستان میں ہے' حسبِ سابق قائم رکھا جائے یا اسے ایک آزاد یا کم از کم نیم خودمختار (autonomous) تنظیم کی حیثیت دے دی جائے —— اس بحث کا اصل محرک میں خود ہی تھا۔ اس لیے کہ میں محسوس کرتا تھا کہ ذرائع رسل و رسائل کی تمام تر ترقیوں کے باوجود پاکستان سے .T.I.N.A کے امور کی نگرانی ممکن نہیں ہے —— دوسرے یہ کہ امریکن خواہ مقامی ہوں خواہ ''مہاجر'' ہوں' اسے ایک پاکستانی تنظیم سمجھتے ہیں' جس سے اس کا حلقہ محدود ہو کر رہ گیا ہے اور اس کی دعوت مقامی امریکنوں اور عرب مہاجروں تک نہیں پہنچ رہی۔ مزید برآں میرے سالانہ اسفار کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعض رفقاء یہ سمجھنے لگے ہیں کہ توسیع دعوت تو صرف میرا ہی کام ہے —— ان کا کام تو بس اجتماعات کی حاضری وغیرہ کی خانہ پری کرنا ہے —— بنابریں میری خواہش تھی کہ اس ضمن میں آخری فیصلہ کر ہی لیا جائے —— لیکن ہر بار سالانہ اجتماع میں رفقاء کی غالباً مجھ سے ذاتی محبت اور تعلق خاطر کے باعث غالب اکثریت کے ساتھ فیصلہ برعکس گویا status quo برقرار رکھنے کے حق میں ہوتا رہا اور مجھے خاموش ہونا پڑا۔

اب ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے افسوس ناک واقعے کے بعد میری امریکہ آمد و رفت کا مسئلہ بھی مشکل بلکہ شاید ناممکن ہو گیا ہے۔ (میرا چار سالہ ویزا گزشتہ سال جون جولائی میں ختم ہو رہا

تھا۔ چنانچہ میں نے ویزا کے لیے درخواست جولائی میں داخل کر دی تھی —— لیکن پورے آٹھ ماہ تک اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے اپنا پاسپورٹ واپس منگوالیا' اس لیے کہ مجھے بنگلہ دیش جانے کے لیے وہاں کا ویزا لینا تھا' البتہ یہ غنیمت ہے کہ اس پر rejection کی مہر نہیں لگی!) ادھر تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ میں اس امر پر بحث ہوئی تو اس نے بالاتفاق یہ طے کر دیا کہ اس مسئلے کا TINA کے سینئر حضرات سے مشورہ کرنے کے بعد میں خود ہی کوئی آخری فیصلہ کرلوں' جو ۳۰ رجون سے قبل ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب رفقاءِ تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ کی بیعت میرے نامزد کردہ امیر برادرم مصطفیٰ الترک کے ہاتھ پر ہوگی —— اگرچہ خود ان کی بیعت عالمی تنظیم اسلامی کے نئے امیر حافظ عاکف سعید صاحب کے ساتھ رہے گی! —— تو اگرچہ اس پر .T.I.N.A کے بعض محترم رفقاء کے کچھ تحفظات بھی میرے علم میں آئے' تاہم میرا حتمی فیصلہ یہی ہے —— البتہ مستقبل میں حالات کی کسی تبدیلی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں آگے کی جانب مزید پیش رفت —— یا واپس پسپائی کی کوئی صورت اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس ضمن میں میرا آخری اور قطعی فیصلہ جس پر عمل درآمد شروع ہو چکا ہے' حسبِ ذیل ہے:

احمده واصلی علی رسوله الکریم

اعوذ باللّٰه من الشیطٰن الرجیم ..... بسم اللّٰه الرحمٰن الرحیم

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدة من لسانی (وقلمی) یفقهوا قولی!

اللهم الهمنی رشدی واعذنی من شرور نفسی ۔ آمین!

امّا بعد!

میں اللہ پر توکّل اور اس کی نصرت وتائید کے بھروسے پر تنظیم اسلامی نارتھ امریکہ (ٹینا) کے ضمن میں حسبِ ذیل فیصلوں کا اعلان کرتا ہوں!

۱) ''ٹینا'' کا نصب العین' مقاصد اور نہج حسبِ سابق ہی رہیں گے۔

۲) اس کی ہیئت تنظیمی بھی حسبِ سابق ''بیعت سمع و طاعت (فی المعروف)'' کی منصوص' مسنون اور ماثور اساس پر قائم رہے گی۔

۳) لیکن آئندہ یہ بیعت امیر ٹینا ہی کے ہاتھ پر ہوگی۔

۴) میں نے کچھ عرصہ قبل امیر ٹینا کی حیثیت سے برادرم مصطفیٰ الترک کو دو سال کے لیے نامزد کیا تھا۔ اس کے بعد وہ لاہور آئے اور ان سے گفتگو اور تبادلہ خیال کے بعد مجھے اپنے فیصلے پر مزید انشراح واطمینان حاصل ہوا۔ اب میں انہیں تاحیات امیر ''ٹینا'' کی حیثیت سے نامزد کرتا ہوں۔ چنانچہ یکم جولائی ۲۰۰۳ء کے بعد صرف وہ رفقاء تنظیم میں شامل رہیں گے/ ہوں گے جو برادرم مصطفیٰ الترک سے بیعت کرلیں!

۵) البتہ انہوں نے لاہور میں جو بیعت موجودہ امیر تنظیم اسلامی عزیزم حافظ عاکف سعید صاحب سے کی تھی وہ برقرار رہے گی اور یہی واحد تعلق عالمی تنظیم اسلامی کے مرکز واقع لاہور (پاکستان) اور ''ٹینا'' کے مابین رہے گا۔

۶) امید ہے کہ برادرم مصطفیٰ الترک اس بیعت کے تقاضوں کو کماحقّہا ادا کریں گے' جس کا ایک مظہر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر ''ٹینا'' کے رفقاء یہ شکایت کریں کہ ان کا امیر تنظیم کے فکر یا منہج سے انحراف کر رہا ہے یا وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی معصیت کا حکم دے رہا ہے اور امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید کو یہ شکایات درست معلوم ہوں تو وہ انہیں معزول کر کے رفقاء کے مشورے سے کسی دوسرے شخص کو امیر ''ٹینا'' نامزد کرسکیں گے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا فرداً فرداً اور تنظیم اسلامی کا بحیثیت جماعت حامی و ناصر ہو۔ آمین..... یاربّ العالمین!

المحتاج الی مغفرة الرّب ورحمته

(ڈاکٹر اسرار احمد)
داعی وبانیٔ تنظیم اسلامی

توثیق از مرکزی مجلس عاملہ
وامیر تنظیم اسلامی — دستخط حافظ عاکف سعید

مسئلہ کشمیر: ماضی و حال کے آئینے میں

نعیم اختر عدنان

بھارت کی تقسیم دو قومی نظریہ کی اساس و بنیاد پر عمل میں آئی۔ ۱۴/اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کا دن بھارت نے اپنی آزادی کے لیے منتخب کیا۔ تقسیم ہند سے بہت سے مسائل نے جنم لیا جن میں ایک ''مسئلہ کشمیر'' بھی ہے۔ اس حوالے سے معاملات کی ترتیب کچھ یوں سامنے آتی ہے:

''ریڈکلف ایوارڈ'' کے ذریعے پٹھانکوٹ کے علاقہ کو پاکستان کے بجائے بھارت کا حصہ بنا دیا گیا' اور یوں بھارت کو کشمیر میں دخل اندازی کے لیے زمینی راستہ فراہم کر دیا گیا تاکہ وہ مستقبل میں کشمیر پر مستقل فوج کشی کے ذریعے اپنا تسلّط قائم کرنے کے قابل ہو جائے۔ دوسری جانب کشمیری اور قبائلی مجاہدین نے اپنے زورِ بازو سے کشمیر کا کچھ علاقہ اپنی دسترس میں محفوظ کر لیا' چنانچہ موجودہ آزاد کشمیر اسی جہادی سرگرمی کا بہترین نتیجہ بن کر ظاہر ہوا۔ ۲۴/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو آزاد کشمیر حکومت کا باقاعدہ قیام عمل میں آ گیا۔ بھارتی سیاسی قیادت اور ان کے آقائے ولی نعمت لارڈ ماؤنٹ بیٹن یوں متحرک ہوئے کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا منظور نظر اور خاص الخاص مشیر وی پی مینن کی جموں آمد ہوئی اور اس دورکنی ٹیم نے دھونس اور دھمکی کے ذریعے مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ سے بھارت کے ساتھ الحاق کشمیر کی دستاویز پر دستخط کروا لیے اور مبینہ طور پر قانونی اور فوجی طاقت کے ذریعے کشمیر کا باقی ماندہ حصہ بھارت سے ''الحاق شدہ'' علاقہ بن گیا۔ یہ سب کچھ ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۷ء کو انجام پذیر ہوا۔ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر آزاد کشمیر کہلایا اور بھارت سے ملحق کشمیر کو مقبوضہ کشمیر کا نام دیا گیا۔ یوں اہل کشمیر دو حصوں میں بٹ گئے۔ بانی پاکستان جناب قائداعظم محمد علی جناح نے کشمیر کو پاکستان کی ''شہ رگ'' قرار دیا تو نہرو نے کشمیر کو بھارت کا ''اٹوٹ انگ'' کہا۔ وہ دن اور آج کا دن کشمیری آگ اور خون کے مابین مجبور و مقہور زندگی بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔

بانی پاکستان نے ایک دلیرانہ' جرأت مندانہ اور ملی اور قومی امنگوں سے ہم آہنگ فیصلہ کیا اور پاکستان کی مسلّح افواج کے اس وقت کے کمانڈر انچیف کو بھارتی مقبوضہ کشمیر پر حملہ کرنے کا حکم دیا مگر شومی قسمت جنرل گریسی نے قائداعظم محمد علی جناح کا حکم یہ کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا کہ میں آپ کی بجائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جواب دہ ہوں۔ یوں اس اولین ناکامی کا اہلِ پاکستان کو کشمیر کے حوالے سے سامنا کرنا پڑا۔ بھارت کی قیادت نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مقبوضہ کشمیر میں استصوابِ رائے کے وعدہ کے ساتھ جاری لڑائی کو ''جنگ بندی'' میں تبدیل کرا لیا۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام قائم ہونے والے کمیشن نے بھارت اور پاکستان کو اپنے زیر قبضہ کشمیر سے فوجیں واپس بلانے کو کہا۔ پاکستان نے اس مشورہ کو قبول کر لیا مگر بھارت نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اگست ۱۹۴۹ء میں یو این کمیشن نے قرار دیا کہ کشمیر سے فوجی انخلاء کا معاملہ ایک ثالث ایڈمرل نمٹز (Nimtz) کے ذریعے کروانے کی تجویز دی اور مذکورہ شخص ہی کو استصواب رائے کا ناظم مقرر کیا گیا۔ اس تجویز کو امریکی صدر ٹرومین اور برطانوی وزیراعظم ایٹلی کی حمایت بھی حاصل تھی' مگر حسبِ روایت پاکستان نے اسے تسلیم کر لیا جبکہ بھارت نے ایسا کرنے سے معذرت کر لی۔ ایک مرتبہ پھر سلامتی کونسل نے کینیڈا سے تعلق رکھنے والے جنرل میکناٹن (Macnaughton) کو کشمیر کے بحران کا حل نکالنے کا اختیار دیا۔ موصوف نے بحران کے حل کے لیے تجاویز مرتب کیں۔ ان تجاویز پر عمل درآمد کے لیے پاکستان نے اپنی آمادگی ظاہر کر دی مگر بھارت نے حسبِ سابق ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ مزید برآں سلامتی کونسل نے کشمیر کے حل کے لیے سر اوون ڈکسن (Sir Owen Dixon) کو اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ ان کی طرف سے پیش کردہ تجاویز کو بھارت نے ماننے سے انکار کر دیا' پاکستان کو تو گویا انکار کی عادت ہی نہ تھی۔

سلامتی کونسل نے ڈاکٹر فرینک لی گراہم کو اپنا نمائندہ مقرر کیا کہ وہ فریقین کی رائے سے کشمیر میں استصوابِ رائے کے لیے متنازعہ امور طے کریں' چنانچہ مقصد کے حصول کے لیے یہ تجویز بھی دی گئی کہ بین الاقوامی عدالتِ انصاف کا صدر ثالثوں کا تقرر کرے گا —— بھارت نے اس کوشش کو بھی اپنی روایتی ہٹ دھرمی سے ٹھکرا دیا۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۸ء تک کے عرصہ

میں ڈاکٹر فرینک لی گراہم نے سلامتی کونسل کی تائید وحمایت سے چھ مختلف رپورٹیں مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے مرتب کیں‘ ان سب تجاویز کا حشر سابقہ رپورٹوں کی طرح ہی ہوا۔ یعنی پاکستان نے انہیں تسلیم کرلیا جبکہ بھارت نے ’’میں نہ مانوں‘‘ کی رٹ لگائے رکھی۔ اس اجمال کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ۲۳ دسمبر ۱۹۵۲ء کو سلامتی کونسل نے ڈاکٹر گراہم کی پہلی تجویز کو باقاعدہ منظور کر کے فریقین کو عمل درآمد کے لیے کہا‘ مگر بھارتی قیادت نے ’’مسترد مسترد‘‘ کے علاوہ کوئی لفظ سیکھا ہی نہیں ہے۔ پانچویں رپورٹ سے متعلق سلامتی کونسل نے سویڈن کے سفیر گنار یارنگ کو اختیار دیا کہ وہ قضیہ کشمیر پر باہمی مذاکرات کا تعطل دور کریں اور اس رپورٹ میں لفظ ’’ثالثی‘‘ کے استعمال سے بھی گریز کیا گیا‘ مگر بھارت کی طبع نازک نے ان سب احتیاطوں کے ساتھ مرتب کردہ فارمولے کو بھی رد کردیا۔

۱۹۵۷ء میں سلامتی کونسل نے ازسرِنو ڈاکٹر گراہم کو مسئلہ کشمیر کے حل کا مشن سونپا۔ ڈاکٹر گراہم نے پانچ نکاتی فارمولا ترتیب دیا جو کہ انتہائی منصفانہ معقول‘ معتدل اور قابل عمل تجاویز کا حامل تھا۔ مگر بھارت کی ہٹ دھرمی سے یہ کوشش بھی ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر گراہم نے اپنی چھٹی اور آخری رپورٹ سلامتی کونسل میں پیش کردی۔ یہ رپورٹ چار سال کا عرصہ گزرنے کے بعد ۱۹۶۲ء میں غور کے لیے پیش ہوئی۔ آئرلینڈ کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے قرارداد پیش ہوئی جس میں فریقین کو سلامتی کونسل کی سابقہ قراردادوں کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کو باہمی افہام وتفہیم سے حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا مگر سوویت یونین نے اس قرارداد کو ویٹو کردیا۔ یہ امر بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ سلامتی کونسل کے ذریعے جب بھی مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے ٹھوس اور قابلِ عمل لائحہ عمل پیش ہوا‘ تو اسے سوویت یونین نے بھارت کے ساتھ اپنا حق دوستی ادا کرتے ہوئے ہمیشہ ویٹو کردیا‘ چنانچہ روس نے مسئلہ کشمیر پر کئی مرتبہ بھارت کے حق میں اپنا ویٹو کا اختیار استعمال کر کے ’’جس کی لاٹھی اس کی بھینس‘‘ کے قانون پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ روس کا یہ عمل بالکل امریکہ جیسا ہی ہے کہ مسئلہ فلسطین کے حل کے لیے سلامتی کونسل یا کسی دیگر ادارے کی طرف سے پیش کردہ قرارداد کو امریکہ کی جانب سے ویٹو کردیا جاتا رہا ہے۔ گویا دنیا کی دو بڑی طاقتوں نے کشمیر اور فلسطین کے حوالے سے ’’might is right‘‘ ہی کو اصل دستور وقانون بنا رکھا ہے۔ اس تناظر میں ہمیں

علامہ اقبال کا یہ شعر یاد آرہا ہے جس میں انہوں نے مغربی طاقتوں کی کیا خوب عکاسی کی ہے۔

یہ علم‘ یہ حکمت‘ یہ تدبّر‘ یہ حکومت
پیتے ہیں لہو‘ دیتے ہیں تعلیم مساوات

مسئلہ کشمیر کے ضمن میں مقبوضہ کشمیر کی اس وقت کی قیادت کے کردار کا تجزیہ بھی کیا جانا ازبس ضروری ہے۔ کشمیر کا مسئلہ جب پہلے پہل بین الاقوامی سطح پر اٹھایا گیا تو بھارتی وفد کے ساتھ شیخ عبداللہ بھی یو این او گئے تھے۔ پاکستانی وفد کے افراد میں سے کسی نے شیخ صاحب کو پاکستان کے موقف کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تو وہ طیش میں آگئے اور انتہائی غرور اور تکبّر سے بولے: ’’بھارت کے ساتھ کشمیر کا الحاق قطعی اور اٹل ہے۔ اب تو خدا بھی خود آکر اسے توڑنا چاہے‘ تو یہ نہیں ٹوٹ سکتا‘‘۔ جناب شیخ عبداللہ کی اس گستاخانہ گفتگو کے چشم دید گواہ ابوالاثر حفیظ جالندھری ہیں‘ جنہوں نے یہ سب کچھ ’’شہاب نامہ‘‘ کے مصنف قدرت اللہ شہاب کو سنایا۔ (شہاب نامہ‘ ص ۳۸۹)

اکتوبر ۱۹۵۰ء کی آئینی ترامیم کی رو سے بھارت کو یہ اختیار حاصل ہوگیا کہ کشمیر میں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق قوانین نافذ کرسکے گا۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں مقبوضہ کشمیر میں اسی اختیار کے تحت بھارت نے آئین ساز اسمبلی قائم کرنے کا ڈرامہ کر کے ریاست کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق پر مہر تصدیق ثبت کرنے کا منصوبہ تیار کرلیا‘ حالانکہ سلامتی کونسل نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعے پہلے ہی سے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کی ریاستی اسمبلی کو الحاق کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا سرے سے استحقاق حاصل نہیں ہوگا۔ وہ بھارت جس نے سلامتی کونسل کی قراردادوں کی بالادستی تسلیم کرنے کا اقوامِ عالَم کے سامنے عالمی فورم کے سامنے بارہا اقرار کیا‘ اسی بھارت نے عملی طور ڈھونگ ریاستی انتخابات‘ دھاندلی زدہ ووٹنگ‘ چالبازی کے طریقوں‘ دجل وفریب کے ہتھکنڈوں کے ذریعے شیخ عبداللہ کی جماعت کو ریاستی اسمبلی کی تمام نشستیں (۷۷) بلامقابلہ پیش کردیں۔ چنانچہ دس ماہ کے وقفہ کے بعد جولائی ۱۹۵۲ء میں شیخ عبداللہ نے الحاقِ کشمیر کی شرمناک اور منحوس دستاویز پر اپنے دستخط ثبت کردیے۔ یہ دستاویز ’’معاہدۂ دہلی‘‘ (Delhi Agreement) کے نام سے موسوم کی گئی۔ یوں ریاست کشمیر کا پورا وجود بھارتی حکومت کے زیرنگیں آگیا۔ یہ امر بھی ازحد دلچسپ ہے کہ ایک سو چھ برس قبل انگریزوں نے کشمیر کی شکل میں جنت ارضی کو صرف ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپے کے عوض گلاب

سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ اس سودے پر علامہ اقبال نے یوں اپنی رائے کا اظہار فرمایا تھا ؎

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند!

اور اب ۱۹۵۲ء میں دین وملت کے غدار شیخ عبداللہ نے معاہدہ دہلی کے نام پر ''سرزمین کشمیر'' کو پنڈت جواہر لال نہرو کے قدموں میں ڈال دیا' وہ بھی محض اپنی چند روزہ چوہدراہٹ اور کرسی کے لیے۔ مگر غدار تو غداری ہی ہوتا ہے۔ اس غلامی اور وفاداری کے باوجود ہندوستان نے ۹/اگست ۱۹۵۳ء کو کٹھ پتلی وزیراعلیٰ شیخ عبداللہ کو معزول کر کے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ اب قرعہ فال بخشی غلام محمد کے نام نکلا اور ریاستی اسمبلی کی قیادت بطور وزیراعلیٰ بخشی غلام محمد کے سپرد کر دی گئی۔ فروری ۱۹۵۴ء میں کشمیر کی نام نہاد اسمبلی نے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کی توثیق کر دی۔ یوں ایک کے بعد ایک غدار پیدا کر کے بھارت نے گویا یہ فیصلہ سنا دیا کہ بھارت کے زیر قبضہ مقبوضہ کشمیر پر رائے شماری' حق خود ارادیت' استصواب رائے یا ریفرنڈم کا سورج کبھی طلوع نہیں ہوگا اور یوں پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں کشمیر بھارت کا ''اٹوٹ انگ'' بن گیا۔

یہ تو غیروں کی ستم رانیوں کی داستان تھی' اب آپ کو اپنوں کی کچھ مہربانیوں کا حال احوال بھی دکھاتے ہیں۔ قدرت اللہ شہاب لکھتے ہیں:

۲۰ نومبر ۱۹۶۲ء کی رات میں راولپنڈی میں اپنے گھر سویا پڑا تھا' رات کے ڈھائی بجے تھے کہ ایک چینی دوست کی گاڑی میری کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی..... اس نے مجھے بتایا کہ بھارت نے چینی سرحدوں پر پے در پے حملے کر کے چین کو جوابی کارروائی پر مجبور کر دیا ہے اور چینی فوج کئی مقامات پر بھارت میں داخل ہو کر آگے بڑھ رہی ہے۔ اور وہ اس وقت مجھے یہی اطلاع دینے آیا ہے۔ میں نے پوچھا ''کیا آپ نے یہ بات ہماری وزارت خارجہ تک پہنچا دی ہے؟'' چینی مسکرایا اور بولا ''ہمارا خیال ہے کہ شاید صدر جنرل ایوب کو اس خبر میں خاصی دلچسپی اور اہمیت محسوس ہو۔ ہمارے اندازے کے مطابق آپ یہ خبر ان تک فوری طور پر پہنچانے میں زیادہ کام آسکتے ہیں' اسی لیے ہم نے آپ کو ایسے بے وقت جگا کر یہ تکلیف دی ہے''..... میں نے فوراً لباس تبدیل کیا اور اپنی کار نکال کر تیز رفتاری سے ایوانِ صدر جا پہنچا۔ اس وقت کوئی تین بجے کا عمل تھا۔ کسی قدر تگ ودو کے بعد مجھے صدر ایوب خان کی خواب گاہ تک رسائی ہوگئی' میں نے انہیں

چینی کے ساتھ اپنی گفتگو تفصیلاً سنانے کے بعد..... تجویز پیش کی کہ اسی لمحے اگر ہماری افواج کی نقل وحرکت بھی مقبوضہ کشمیر کی سرحدوں کے خاص خاص مقامات کی جانب شروع ہو جائے تو..... صدر ایوب نے تند و تیز لہجے میں میری بات کاٹ کر کہا ''تم سویلین لوگ فوجی نقل و حرکت کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہو۔ جاؤ اب تم بھی جا کر آرام کرو' مجھے بھی نیند آ رہی ہے''۔ آج تک میرا یہی خیال ہے کہ اس رات صدر ایوب نے اپنی زندگی اور صدارت کا ایک اہم ترین سنہری موقع ہاتھ سے گنوا دیا۔ اگر ان کی قائدانہ صلاحیتوں پر نیند کا غبار نہ چھایا ہوتا اور ان کے کردار میں شیوۂ دیوانگی اور شیوۂ مردانگی کا کچھ بھی امتزاج ہوتا' تو غالباً اس روز ہماری تاریخ کا دھارا ایک نیا رخ اختیار کر سکتا تھا۔ (شہاب نامہ' ص ۸۷۱-۸۷۳)

معاہدۂ تاشقند کے احوال وظروف کی کہانی' وزیر خارجہ بھٹو کی زبانی:

مسئلہ کشمیر کے حوالے سے روس کی زیر سرپرستی بھارت اور پاکستان کے مابین گفتگو ہوئی۔ پاکستان کے صدر جنرل ایوب خان اور بھارتی وزیراعظم لال بہادر شاستری کے درمیان گفتگو کی میزبانی روسی وزیراعظم کوسیجن کی ذمہ داری قرار پائی۔ بقول ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ تھے' روسی وزیراعظم نے کئی بار صدر ایوب خان پر زور دیا کہ وہ مذاکرات کو ناکام نہ ہونے دیں اور مسٹر شاستری کے ساتھ اپنی گفتگو جاری رکھیں۔ ایک بار صدر ایوب مذاق میں مسٹر کوسیجن سے یہ کہہ بیٹھے ''مجھے ہرگز یہ توقع نہیں ہے کہ اس بالشت ڈیڑھ بالشت کے منحنی سے شخص (شاستری کا قد انتہائی چھوٹا تھا) کے ساتھ کوئی فیصلہ کن گفتگو ہو سکے''۔ اس طنزیہ اور استہزائیہ جملے پر مسٹر کوسیجن سیخ پا ہو گئے اور انہوں نے نہایت سختی سے صدر ایوب سے کہا ''مسٹر شاستری ایک عظیم قوم کے مسلمہ اور عظیم لیڈر ہیں' ہم ان کی دل سے عزت کرتے ہیں' آپ کو ہرگز یہ زیب نہیں دیتا کہ میرے سامنے ان کی شان میں آپ اس قسم کے گھٹیا الفاظ استعمال کریں''۔ اور پھر بقول بھٹو کوسیجن کی اس ایک ڈانٹ نے جنرل ایوب خان کے دل ودماغ سے خود اعتمادی کا غبارہ بھک سے اڑا کر نکال باہر پھینکا' اور اس کے بعد وہ معاہدۂ تاشقند میں شاستری جی کی ہر ضد کے سامنے بلا پس وپیش ہتھیار ڈالتے چلے گئے۔'' (شہاب نامہ' ص ۸۸۰)

لال بہادر شاستری اور ان کے وزیر خارجہ نے یہ اعلان کیا کہ جموں کشمیر کی ریاست بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اور پاکستان کا اس کے کسی حصہ پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے۔ دوسری

جانب مسئلہ کشمیر پر پاکستانی قیادت کا موقف یہ تھا کہ ’’تنازعہ کشمیر کا حل ہم نے پاکستان کے مفاد کے تناظر میں ڈھونڈنا ہے۔ اس حل کی تلاش میں پاکستان کو داؤ پر نہیں لگا سکتے۔‘‘

۸ روزہ مذاکرات کے بعد ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو بھارتی وزیر اعظم شاستری اور پاکستان کے صدر ایوب خان نے معاہدۂ تاشقند پر دستخط کر دیے۔ روسی وزیر اعظم نے اس معاہدہ پر اپنی گواہی ثبت کر دی۔ روسی وزیر اعظم نے بھارتی اور پاکستانی وفود کے لیے الگ الگ شاندار دعوتی تقریبات منعقد کیں۔ پاکستانی وفد کے اراکین کسی قدر بجھے بجھے اور افسردہ دل تھے جبکہ بھارتی اراکین وفد خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور پھدک پھدک کر چہک چہک کر اپنی شادمانی اور مسرت کا برملا اظہار کر رہے تھے۔ بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری بھی فخر و انبساط سے سرشار تھے...... کہ انہیں شادیٔ مرگ نے آ دبوچا اور وہ حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے وہیں وفات پا گئے...... معاہدۂ تاشقند کے بعد مسئلہ کشمیر کا حوالہ سکیورٹی کونسل کی قراردادیں نہ رہی تھیں...... شاستری کے تابوت میں اس کا جسد خاکی ہی نہ تھا بلکہ مسئلہ کشمیر پر یو این او میں ہماری تمام پیش رفت بھی لپیٹ کر مقفل کر دی گئی تھی۔

شملہ معاہدہ: ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو مسئلہ کشمیر معاہدۂ تاشقند کے تابوت میں ڈال دیا گیا تھا‘ جس کے چھ برس بعد ۱۹۷۲ء میں بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی اور پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے مابین معاہدۂ شملہ نے اس تابوت میں ایک اور کیل ٹھونک دی۔ (شہاب نامہ)

مسئلہ کشمیر پر بعد ازاں میاں محمد نواز شریف اور اٹل بہاری واجپائی کے درمیان ’’اعلانِ لاہور‘‘ میں کچھ گفتگو ہوئی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات‘ مسئلہ کشمیر لاینحل ہی رہا۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے ضمن میں بھارتی اور پاکستانی قیادت کے مابین آگرہ میں بھی مذاکرات کا دور چلا جو بے نتیجہ رہا۔ اور اب تازہ بتازہ واردات یہ ہوئی ہے کہ عمران کے دورۂ امریکہ کے دوران امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے مسئلہ کشمیر پر ثالثی کی بات کی اور جناب عمران خان واپسی پر اتنے سرشار تھے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ جیسے میں ورلڈ کپ جیت کر آ رہا ہوں...... ابھی دورۂ امریکہ پر بحث ومباحثہ جاری تھا کہ بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی نے ریاست کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر کے اسے باقاعدہ بھارت کا اٹوٹ انگ بنانے کے لیے عملی اقدامات کیے ہیں۔ تادمِ تحریر مقبوضہ کشمیر کے لاکھوں باشندے کرفیو کی زد میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا زندگی کے دن گن رہے ہیں اور ہم کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ ہی قرار دے رہے ہیں۔ ۞۞۞

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کی ۲ کتب
قلبِ قرآن
سُورۂ یٰسٓ ۳۶
کی مختصر تشریح
صفحات: 152، قیمت: 130 روپے
خطباتِ سیرت علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام
صفحات: 196‘ قیمت: 160 روپے
خود پڑھیے ...... دوسروں کو تحفہ دیجیے!
مکتبہ خُدام القرآن لاہور
36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-35869501
maktaba@tanzeem.org

رسول اکرم ﷺ کی عظمت، آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت، اسوۂ رسول ﷺ کے قرآنی تصور، سیرتِ نبوی ﷺ کے مختلف گوشوں، خاص طور پر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے انقلابی پہلو جیسے علمی و عملی موضوعات پر 9 کتابوں کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

از ڈاکٹر اسرار احمدؒ

دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ

516 صفحات پر مشتمل فکر انگیز تالیف

اشاعت خاص (مجلد):

امپورٹڈ آفسٹ پیپر، قیمت: 450 روپے

اشاعت عام (پیپر بیک):

امپورٹڈ بک پیپر، قیمت: 300 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: 3-042-35869501

maktaba@tanzeem.org

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہج انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل

اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک

اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

صفحات: 375 ✿ قیمت اشاعت خاص: 400 روپے اشاعت عام: 250 روپے

”منہج انقلابِ نبویؐ“ کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

صفحات: 64 ✿ قیمت اشاعت خاص: 50 روپے ✿ اشاعت عام: 30 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36-کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501